ISSN 0974-7346

جنوری ۲۰۲۵ء

جلد۲۱۲ — عدد ۱

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰؍روپے۔ فی شمارہ ۴۰؍روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰؍روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰؍روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰؍روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر: 0504010100046001

آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۲۵ء عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

۲۰۲۴ء بھی اپنی آخری منزل کو پہنچ گیا۔ عموماً جب فراغت، اطمینان اور ذہنی و معاشی سکون ہمراہ ہو تو ان کو شاعر، عیش کے دنوں سے تعبیر کرتا ہے، جو دیکھتے دیکھتے یوں گزر جاتے ہیں کہ زندگی کا سفر مختصر سا نظر آنے لگتا ہے مگر جب یہی دن 'ایام مصیبت' میں بدلتے ہیں تو پھر اسی شاعر کو یہ دن ایسے نظر آتے ہیں جو کاٹے نہیں کٹتے۔ ۲۰۲۴ء بھی گزشتہ کئی برسوں کی طرح ملک و قوم کی اکثریت کے لیے کچھ اسی قسم کا احساس دینے والا سال بن گیا، اس اکثریت کا صرف نہایت قلیل حصہ ہی بظاہر بے فکر اور اپنے حال سے خوش کہا جاسکتا ہے، ورنہ مذہب کے نام سے اکثریت واقلیت کے خانوں میں منقسم، ملک کی بڑی آبادی مسلسل آزمائشوں، مشکلوں اور مصیبتوں سے دوچار ہی رہی۔ بے روزگاری، بڑھتی جاتی غریبی اور مہنگائی کے ساتھ معاشرے کے تمام شعبوں میں نفرت، غرور، جھوٹ، رشوت اور مالی بدعنوانیوں کی وبائے عام نے جہاں بربادی مچارکھی، وہیں حکومت کے اکثریتی جبر اور قوت واقتدار کے غیر اخلاقی اور غیر قانونی طرزعمل نے تعداد میں کم لیکن ملک کی تاریخ اور اس کی زمین سے پیوست رہنے والی بڑی آبادی کو جس طرح محکومیت اور غیریت کا احساس دلایا ہے، شاید ہندوستان کی تاریخ میں اس سے پہلے اس منظم طریقہ اور سازشانہ ذہنیت کے ساتھ عمومی طور پر اس کی مثال نہ تلاش کی جاسکتی ہے اور نہ ہی کوئی بڑے سے بڑا خائن اور کذاب اس کو پیش کر سکتا ہے۔ سیاست اور حکومت کے چہرے، لہجے، طور طریقے، وقت کے ساتھ ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ نظر آتے رہتے ہیں۔ جس کا اثر بھی قوموں کی زندگی میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ مگر ملک عزیز میں ادھر، وقت اور زمانہ کی ہر کروٹ میں گویا کوئی نیا فتنہ جاگتا نظر آتا ہے۔ مستقبل کا مورخ شاید تیزی سے بدلتی اس صورت کی تصویرکشی کا بھی متحمل نہ ہوسکے گا کہ حکومت، مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ اوراخباری ابلاغیہ جیسے معاشرہ کی تعمیر و ترقی کے ضامن وذمہ دار شعبوں میں ایسی بے حسی اور ایسی بے بسی اور اس سے بھی زیادہ بے عزتی اور بے غیرتی کیوں کر رگ وریشے میں سرایت کرگئی۔ ظلم وجور کی اتنی داستانیں کہ اب ان کے لیے عنوان اور سرخیاں بھی کم پڑ گئیں۔ ۲۴ء نے جاتے جاتے مفروضوں کی بنیاد پر قدیم عمارتوں، مکانوں، عبادت گاہوں کی بنیادوں کی تاراجی اور تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ ان کی شکست وریخت کا منظر بھی دیکھ لیا۔ خاموش عمارتوں کا درد ظالم کیا محسوس کریں جب دیکھنے اور سننے والی صلاحیتیں ہی سلب کرلی جائیں تو بے گناہوں کی لاشوں پر خون کے آنسو بہتے کہاں سے نظر آسکتے ہیں۔ عجیب ہوا چلی کہ کسی عبادت خانہ کی تہہ میں اپنے معبد کا وہم، ایک وجود بنادیا گیا۔ سنبھل سے اجمیر تک اور کاشی سے دلی تک، ملک کے انتظام وانصرام کے ذمہ داروں کے لیے بس کرنے کا کام یہ طے کردیا گیا کہ

وہ ایک مذہبی اقلیت کے ہر شعار کو اپنا شکار بنائے۔ ایک مخصوص گروہ کے تعصب اور تنگ نظری اور بے ظرفی کو مذہبی اعتقادی اختلاف کے پردے میں اس طرح پیش کیا گیا کہ صدیوں سے اپنے وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے اپنے ہی ہم وطنوں کی نظر میں اجنبی بلکہ بے وفا دشمن نظر آنے لگے اور اس کی سب سے بڑی اور شاید سب سے عبرت ناک مثال خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ ہے۔ جس کی شناخت مذہب سے زیادہ محبت کی فراوانی سے ہے اور صدیوں سے ہوتی آئی ہے۔ کیا انقلاب زمانہ ہے کہ قریب سو سال پہلے انگلستان کے تخت و تاج کے ولی عہد ایڈورڈ ہشتم، اسی شہر چشتی میں آئے اور ان کو آج ہی کی ذہنیت والے اس وقت کے چند ارباب حکومت نے زیارت سے محروم رکھا تو معارف نے لکھا کہ جہاں ایک زندہ جاوید ہستی کا جسد خاکی مدفون ہے، جس کا سنگ در کروروں نفوس کا مرکز عقیدت ہے اور جس کی عقیدت غیر مذاہب کے ہزاروں لاکھوں لوگوں کے قلوب میں بھی اس قدر راسخ ہے جو آج تک کم از کم ہندوستان کے کسی دنیوی حکمراں کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اگر وہاں کسی حاکم وقت کو جانے سے روکا گیا تو کہیں اس کی تہہ میں یہ سبب تو مخفی نہیں کہ ایک داعی حق کی قربت و صحبت کے تحمل کا یارا نہیں تھا۔ معارف نے پھر یہ سوال کیا کہ آفتاب کی ضیاپاشی ہم آپ اپنے لیے کتنا ہی باعث برکت قرار دیں مگر کیا عالم حیوانات کی ہر نوع اس کی تصدیق کے لیے تیار ہوگی؟ اس سوال کی نشتریت ہی اس کا جواب ہے۔ اور یہ ایسا تشریح طلب بھی نہیں، بات واضح ہے کہ جس طبقہ کے ضابطہ اخلاق میں انکسار، غیرت اور رواداری کا وجود ہی نہ ہو، جہاں مکر و فریب اور جھوٹ اور وعدہ فراموشی کو حکمت عملی کا نام دے کر حکمرانی کا کمال سمجھا جاتا ہو اور جس سیاست کی تمام تر بنیاد، خود کو برتر سمجھ کر باہمی کش مکش پر ہو، اس کو بجز درندے سے انسانوں کی حفاظت کی امید کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ وقت کے فرعونوں کی خود اعتمادی دراصل خود فراموشی و خود فنائی ہے۔ کاش قوم یہ حقیقت سمجھ لے۔

***

نومبر کے مہینے میں علامہ شبلی، مولانا فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اسی جذبہ کے تحت علامہ شبلی کی یادوں کے چراغ متعدد اداروں میں روشن کیے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی کی یاد ان کے شاگردوں کی بھی یاد دلاتی ہے۔ بڑے شہروں میں یہ جشن چراغاں، کوئی غیر معمولی منظر نہیں، لیکن علم و ادب کے مہر و ماہ کی سلامتی کی غرض سے اگر یہ جشن ان بستیوں میں نظر آئے جو اردو کے جغرافیہ سے دور اور جدا ہوں تو حیرت کا مسرت میں بدل جانا واقعی بڑا خوش گوار احساس ہے۔ اوڈیشہ میں بالاسور یا بالیشور شہر ہے۔ اس کی فقیر موہن یونی ورسٹی بھی اس شہر کی طرح زیادہ مشہور نہیں۔ وہاں کی عام زبان اڑیا ہے۔ اوڈیشہ میں کٹک، بھدرک جیسے علاقوں کے سوا کہیں اردو آبادی نہیں، معلوم ہوا کہ پورے صوبے میں اردو جاننے والے صرف دو فی صد ہیں۔ اڑیا زبان کی اس حکمرانی میں فقیر موہن یونی ورسٹی کی

پی۔جی کونسل میں اردو زبان کا ہونا اور اس سے زیادہ اردو طلبہ کا مل جانا واقعی تعجب کا سبب ہے۔ لیکن سرسبز کوہساروں اور اس کی ایک نہایت خوبصورت وادی میں جس طرح ایک نئی یونی ورسٹی کی خوبصورت عمارتیں، شہر سے قریب سولہ سترہ کلومیٹر کے فاصلے کے باوجود علم کی چاہت والوں کو اپنی کشش سے کھینچ لاتی ہیں، اسی طرح پی جی کونسل میں اردو کے دو سچے نمائندے، ڈاکٹر شاداب اعظمی اور ڈاکٹر شارب اعظمی ہیں۔ ڈاکٹر شاداب نے علامہ شبلی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انہوں نے اپنی جدوجہد سے اڑیا کی زمین پر اردو کا گلشن سجانے میں جو کامیابی حاصل کی اس کا ایک نمونہ "علامہ شبلی ایک عبقری شخصیت اور ان کی عصری معنویت" کے عنوان سے وہ سمینار ہے جس میں کلکتہ، آسنسول، جمشید پور، بھدرک اور کٹک کے اردو اہل قلم نے شریک ہو کر اور مقالات و مضامین پیش کر کے شبلی کی جہاں گیری کا عجب مسحور کن نظارہ پیش کر دیا۔ ڈاکٹر احمد بدر، ڈاکٹر سعید احمد، ڈاکٹر جمشید احمد، ڈاکٹر محمد رحمت اللہ اشرف وغیرہ نے بتایا کہ اردو کی عالم گیری کیوں ہے؟ اس سے بھی زیادہ مسرت کے وہ لمحے تھے جب اڑیا زبان کے مقبول اور پچاسوں کتابوں کے مصنف پروفیسر دیباشش پاترا اور پی جی کونسل کے چیرمین پروفیسر بھاسکر بہیرا کی اڑیا زبان میں شبلی کی عظمت پر ادا ہونے والے الفاظ تھے۔ جو سمجھ میں نہ آنے کے باوجود دلوں میں اتر رہے تھے۔ سمینار کے انعقاد میں اوڈیشہ اردو اکیڈمی کا تعاون بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس کے وائس چیرمین جناب سید نفیس دسنوی ہر لمحہ، سمینار کی کامیابی کے لیے وقف نظر آئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے خاندانی تعلق نے ان کو اور بھی سرگرم عمل بنا دیا۔ لیکن اڑیا زبان میں اور اڑیا ماحول میں غالباً پہلی بار علامہ شبلی کی خدمات کے ذکر کا سارا سہرا ڈاکٹر شاداب کے سر ہے۔ اب ان کی محنت سے معراج النساء، ریشمی خاتون اور محمد خورشید علی جیسی ہونہار نئی نسل سامنے آرہی ہے۔

***

افسوس جہاناگنج، اعظم گڑھ کے مولانا عبدالرب قاسمی طویل علالت کے بعد وفات پاگئے۔ ملت کے لیے خود کو پوری طرح وقف کر دینے والے مولانا نے ٹھوس ملی کاموں کا ایک جہاں آباد کر دیا تھا۔ وہ مولانا محمود مدنی سے زیادہ قریب اور متاثر تھے۔ اسی لیے یوپی کی جمعیۃ العلماء کی ساری ذمہ داری بھی ان ہی کی تھی۔ اس میں ان کی تنظیمی صلاحیت سے زیادہ ان کی سادگی، خلوص، بے غرضی اور انکسار و فروتنی کو دخل ہے۔ شہر آتے تو دارالمصنّفین ضرور تشریف لاتے۔ بڑی موذی بیماری ان سے محرومی کا سبب بنی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

***

سامان طباعت اور ڈاک خرچ کی ہوش ربا گرانی نے معارف کے زر سالانہ وماہانہ میں اضافے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ اب ایک شمارہ کی قیمت چالیس روپے اور سالانہ چار سو روپے ہوگی۔

***

مقالات

خواجہ احرار اور رسالۂ فقرات

ڈاکٹر عارف نوشاہی
ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد
naushahiarif@gmail.com

خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار (۱۴۰۴-۱۴۹۰ء) وسطی ایشیا میں سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک جلیل القدر بزرگ گذرے ہیں۔ ان کا شجرۂ طریقت ایک درمیانی واسطے مولانا یعقوب چرخی (م: ۱۴۴۷ء) سے خواجہ بہاء الدین محمد نقشبند بخاری (م: ۱۳۸۹ء) سے جا ملتا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں وسطی ایشیا کی روحانی، سیاسی اور معاشرتی بساط پر خواجہ احرار کا کردار غیر معمولی رہا اور ان کے کاموں کے دیرپا اثرات مرتّب ہوئے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کی تعلیمات کی اشاعت میں وہ خود اور ان کے خلفا کی جماعت فعّال رہی۔ چنانچہ آج وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا کے ممالک، نیز افغانستان اور ترکیہ میں نقشبندیہ اور اس کی معروف شاخ مجدّدیہ کا شجر خواجہ احرار کے اخلاف اور مریدوں کی کوششوں اور آب یاری سے بارور ہے۔ مجدّدیہ کے ظہور سے پہلے خواجہ احرار کے پیروکار اپنی نسبت "احراری" لکھتے رہے ہیں، جیسا کہ خواجہ محمد باقی باللہ (م: ۱۶۰۳ء) اور میر ابو العلاء اکبر آبادی (م: ۱۶۵۱ء) نے اپنی تصانیف میں اس کا اظہار کیا ہے۔

خواجہ احرار اپنی گوناگوں سیاسی، روحانی، سماجی اور معاشی مصروفیات کے باعث، اپنے ہم عصر، ہم مشرب اور قریبی دوست مولانا عبد الرحمان جامی (م: ۱۴۹۲ء) کی طرح کثیر التصانیف نہیں تو ہیں، پھر بھی ان سے فارسی زبان میں تصوف پر کچھ رسالے ضرور یادگار ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ، ان کے ملفوظات و حالات پر ان کے مریدوں میر عبد الاوّل نیشاپوری (م: ۱۵۰۰ء) کی مسموعات، مولانا محمد قاضی سمرقندی (م: ۱۵۱۵ء) کی سلسلۃ العارفین و تذکرۃ الصدیقین اور فخر الدین علی صفی کاشفی سبزواری (م: ۹۳۹ھ / ۱۵۳۲-۱۵۳۳ء) کی رشحات عین الحیات جیسی مستقل تصانیف موجود ہیں۔ ان کے ملفوظات کا ایک اور مجموعہ محمد امین کرکی کا تدوین کردہ ہے۔ ان کے خوارق و کرامات و مناقب پر مولانا شیخ (خواجہ احرار کے براہ راست مرید) نے ایک مختصر کتاب لکھی۔ خواجہ احرار کے سلاطین، امرا، مریدوں اور رشتہ داروں کے نام متفرق رقعات اور خطوط بھی دستیاب ہیں۔

یہ تمام مواد، جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، طبع و شائع ہو چکا ہے۔ خواجہ احرار کی اپنی تصانیف سے تین عرفانی رسالے: فقرات، والدیہ اور حورائیہ دستیاب ہیں۔ ان میں سے فقرات، جو حجم میں باقی دو رسالوں سے قدرے بڑا ہے، اہل سنّت و جماعت کے عقائد، سلسلۂ خواجگان کی تعلیمات اور اذکار و عبادات سے متعلق ہے۔ صوفیہ، بالخصوص جنوبی ایشیا کے نقشبندی، مجدّدی اور چشتی حلقوں میں یہ رسالہ بہت مقبول رہا ہے اور یہاں کے اکابر جیسے خواجہ باقی باللہ، شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی اور خواجہ فخر جہاں دہلوی نے سالکوں کے لیے اس کا مطالعہ تجویز کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالکوں اور صوفیہ کی طلب کے پیش نظر فقرات کے متعدد قلمی نسخے تیار ہوتے رہے جن کا ذکر مخطوطات کی فہارس میں ملتا ہے۔ جب جنوبی اور وسطی ایشیا میں چھاپہ خانہ آیا تو فقرات کی طباعتیں بھی ہونے لگیں۔ چنانچہ ہندوستان میں اس کی اولین طباعت بعہد نظام دکن، ۱۹۰۲ء میں مولوی عبد القیوم آغائی ابو العلائی کے اہتمام سے مطبع آئین دکن، حیدر آباد میں ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں یہ رسالہ مطبع یکیلوف، تاشقند، ازبکستان سے طبع ہوا۔ راقم السطور نے فقرات کو خواجہ احرار کے دیگر دو رسالوں (والدیہ، حورائیہ) سمیت مرتّب کیا۔ یہ مجموعہ رسائل خواجہ احرار نام سے ۲۰۱۵ء میں انتشارات احراری، ہرات سے شائع ہوا۔ فقرات کے ترکی زبان میں تین اور عربی زبان میں ایک ترجمہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ترکی ترجمے مولانا خضر بیگ (قلمی)، مصطفی حسین صادق (قلمی) اور عبد الرحمان اجر (مطبوعہ استنبول، ۲۰۱۶ء) کے قلم سے ہیں، جب کہ عربی ترجمہ شیخ محمد مراد بن عبد اللہ منزلوی قازانی (۱۸۵۵-۱۹۳۴ء) کا ہے جو مکتوبات امام ربّانی کے عربی مترجم بھی ہیں اور فقرات کا یہ ترجمہ عربی مکتوبات کے حاشیے پر ہی چھپا ہے (الدرر المکنونات النفیسۃ، مکّہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ، حاشیہ ص ۲۸۱-۳۵۵ و مکرر عکسی طباعت استنبول، سراج کتابوی، بلا تاریخ)۔ جب انیسویں صدی عیسوی میں جنوبی ایشیا سے فارسی زبان اپنا رخت سمیٹنے لگی تو ابنائے وطن کا اپنے اسلاف کے فارسی مآخذ کے مندرجات اور مضامین تک رسائی کا واحد ذریعہ ترجمہ رہ گیا۔ چنانچہ فقرات کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، یہاں بھی اس کے اردو ترجمے ہونے لگے۔ راقم کی اطلاع کے مطابق اب تک اس کے تین مختلف اردو ترجمے انجام پا کر شائع ہو چکے ہیں۔

پہلا ترجمہ مفتی محمد طیب خطیب مسجد گورنر ہاوس، کوئٹہ، پاکستان کا ہے جو ۱۴۳۴ھ / ۲۰۱۳ء میں انجام پایا اور ۱۴۳۸ھ / ۲۰۱۷ء میں مکتبۂ اشرفیہ کوئٹہ سے شائع ہوا۔ فقرات کے ساتھ مترجم کا اپنا تصنیف کردہ رسالہ تحفۂ نقشبندیہ بھی شامل ہے۔ مترجم نے اپنے پیش لفظ میں کہیں نہیں بتایا کہ ان کے ترجمے کی بنیاد فقرات کے کس قلمی یا طبع شدہ نسخے پر ہے۔ مترجم کے پیش نظر جو بھی نسخہ رہا ہو، وہ ناقص تھا۔ نتیجۃً ترجمہ بھی ناقص ہے۔ مترجم نے ابتدا میں خواجہ احرار کے حالات

تاریخ و تذکرہ خواجگان نقشبند از ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا سے بلفظہٖ نقل کیے ہیں۔

دوسرا ترجمہ غلام یٰسین منگھیروی کا ہے جنھوں نے راقم السطور کی اجازت سے میرے مرتّبہ رسائل خواجہ احرار (ہرات، ۲۰۱۵ء) کو بنیاد بنا کر خواجہ احرار کے تینوں رسائل کا ترجمہ کیا ہے جن میں فقرات بھی شامل ہے۔ یہ ترجمہ بزم معینیہ چشتیہ (جگہ کا نام درج نہیں، طبع لاہور) نے جنوری ۲۰۲۲ء میں شائع کیا۔ اس پر راقم السطور کا دیباچہ ہے اور مترجم نے سرورق پر "بر اساس تحقیق و تدوین ڈاکٹر عارف نوشاہی" درج کیا ہے۔

تیسرا ترجمہ، جو اس وقت زیر بحث ہے، اس کے کوائف حسب ذیل ہیں: سیرت خواجہ عبید اللہ احرار و رسالۂ فقرات تصنیف عبید اللہ احرار، ترجمہ و تحقیق علماء مجلس شوری شعبۂ تراجم کتب، زیر سرپرستی ذاکر احمد نقشبندی، ناشر: تبلیغ صوفیا دعوت الی الخیر پاکستان، کراچی، ستمبر ۲۰۲۴ء، ۱۲۳ + ۶۳ + ۹۸ + ۱۵۳ صفحات۔

سرورق کی تصریح کے مطابق یہ ترجمہ "علماء مجلس شوریٰ شعبۂ تراجم کتب" نے کیا ہے۔ یہ شعبۂ تراجم غالباً تبلیغ صوفیا دعوت الی الخیر پاکستان کا کوئی ذیلی ادارہ ہے۔ دیباچے میں ایک مقام پر مترجمین کا نام مولانا محمد شوکت ہزاروی نقشبندی اور مولانا یاسر اقبال نقشبندی مذکور ہے (ص ۱۶)۔ زیر نظر ترجمے کے مقدمے میں صرف مفتی محمد طیّب کے ترجمے کا ذکر ہوا ہے (ص ۱۶) منگھیروی صاحب کے ترجمے کا ذکر نہیں ہوا۔ تاہم زیر نظر ترجمے کے مقدمہ نویس مولانا ذاکر احمد نقشبندی مجدّدی کے کچھ جملوں سے استنباط ہوتا ہے کہ منگھیروی صاحب کا ترجمہ بھی ان کے پیش نظر تھا کیوں کہ مولانا ذاکر احمد کے کچھ جملے ہو بہو منگھیروی صاحب کے 'عرض مترجم' میں موجود ہیں، جیسے: ''مفتی محمد طیب صاحب کے پاس جو فارسی نسخہ تھا وہ مکمل نہ تھا، اس لیے اس میں بہت سے مقامات پر عبارات نہیں ہیں... موقع بہ موقع ان نسخوں کا تقابل بھی کرتا رہا.... ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب کا مرتّب کردہ نسخہ ہی اصح و اکمل ہے لہٰذا اسی نسخہ کو بنیاد بنایا اور پورا ترجمہ اسی کی ترتیب کے مطابق کیا گیا ہے" (دیباچہ ذاکر احمد ص ۱۶؛ عرض مترجم منگھیروی، ص ۶-۷)۔ منگھیروی صاحب نے اپنے 'عرض مترجم' میں تاشقند کے مطبع کا نام غلط یکلیسوف لکھا ہے (ص ۷) مولانا ذاکر احمد نے بھی ویسے ہی دہرایا ہے (ص ۱۶) جبکہ درست نام یکیلوف ہے۔

زیر نظر کتاب تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ 'سیرت خواجہ عبید اللہ احرار' حضرت نثار الحق انصاری (م: ۱۴۴۰ھ / ۲۰۱۸ء) کا لکھا ہوا ہے جسے مولانا ذاکر احمد نقشبندی نے ترتیب دیا ہے۔ دوسرا حصہ فقرات کا اردو ترجمہ ہے۔ تیسرے حصے میں فقرات کے فارسی متن کی دو الگ الگ اشاعتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ایک اشاعت کو 'با تصحیح و مقدمہ عارف نوشاہی، انتشارات احراری،

ہرات' قرار دیا گیا ہے (اس پر آگے چل کر تبصرہ کریں گے)، دوسری اشاعت، فقرات کے تاشقند ایڈیشن کا عکس ہے۔

کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے ایک جملۂ معترضہ لکھتا چلوں۔ 'پیر' اور 'مولوی' حضرات کے ہاں کتب تصنیف اور ترجمہ کرنے یا کروانے کا شوق تو پایا جاتا ہے لیکن اس کے لیے جس علمی ذوق اور تصنیفِ کتاب کے آداب، اخلاق اور اصولوں کی پابندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں سے بعض کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ نہایت بے ذوقی اور بے اصولی سے کتابیں لکھ کر شائع کر دی جاتی ہیں اور دیباچے میں فخر اور نیاز مندی سے لکھا جاتا ہے کہ یہ ان کے پیر یا استاد کے حکم کی تعمیل اور خواہش کی تکمیل ہے! خواہ اس تعمیل اور تکمیل میں بہت سے اصولِ کتاب نویسی نظر انداز ہو گئے ہوں۔

کتاب کا پہلا حصہ، جو خواجہ عبید اللہ احرار کے حالات اور سیرت پر مشتمل ہے، زیادہ تر ملفوظات خواجہ احرار (مسموعات) مرتبہ عبد الاول نیشابوری اور رشحات عین الحیات سے لیا گیا ہے اور کچھ حصہ راقم السطور کی کتابوں احوال و سخنان خواجہ عبید اللہ احرار (تہران، ۲۰۰۲ء)، خواجہ احرار (اسلام آباد، ۲۰۱۰ء) اور خواجہ عبید اللہ احرار (لاہور، ۲۰۱۹ء) سے منقول اور مستفاد ہے۔ لیکن حالات نگار نے اپنے مآخذ کا کہیں ذکر نہیں کیا، بلکہ کتاب میں سرے سے کوئی فہرست مآخذ ہی نہیں ہے۔ مولانا ذاکر احمد کے پیش لفظ (ص ۱۲، ۱۳، ۱۴ متعلقہ فقرات) اور حصۂ سیرت کے اکثر مضامین راقم کی کتب سے لفظ بہ لفظ منقول ہیں لیکن بغیر حوالے کے۔ جیسے خواجہ احرار کی تصانیف، ان کے مخطوطات اور اشاعتوں کا ذکر (ص ۵۱-۵۳، ۶۵)، مشائخ کی فہرست جن سے خواجہ احرار نے ملاقات کی تھی (ص ۴۰)، خواجہ احرار کے مخالفین اور معترضین کا ذکر (ص ۷۷-۷۹)۔ زیر نظر کتاب میں جہاں خواجہ احرار کے ملفوظات (ترجمہ) درج ہوئے (ص ۸۰-۱۲۲) وہ بھی راقم کی کتاب خواجہ عبید اللہ احرار (ص ۱۹۹-۲۲۴) سے بلا حوالہ لفظ بہ لفظ منقول ہیں۔ راقم نے ایک جگہ ایک ملفوظ "مصائب پر صبر و شکر" کے سلسلے میں ایک معاصر واقعے کی مثل دی ہے (خواجہ عبید اللہ احرار، ص ۲۱۰) وہ بھی بعینہٖ نقل کر دی گئی ہے (ص ۱۰۶-۱۰۷)۔ میں نے اپنی کتاب میں میر عبد الاوّل کے جمع کردہ ملفوظات خواجہ احرار کے بارے میں لکھا تھا کہ ہم ان ملفوظات کا تفصیلی جائزہ آگے چل کر لیں گے (خواجہ عبید اللہ احرار، ص ۷۴) زیر نظر کتاب میں مضمون نگار نے من و عن یہ جملہ بھی نقل کر دیا ہے (ص ۸۰) حالانکہ زیر بحث کتاب میں ایسا کوئی جائزہ نہیں ہے! ایسے ہی موقع پر کہا جاتا ہے 'نقل را عقل باید'۔ خواجہ احرار کے حالات اور سیرت کے جو مضامین رشحات عین الحیات سے لیے گئے ہیں وہ بھی حالات نگار کے اپنے ترجمہ کردہ نہیں ہیں۔ راقم السطور نے اطمینان کے لیے سیرت خواجہ احرار میں سے چند ایک مقامات کا رشحات عین الحیات

مترجمہ ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا (مطبوعہ خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ مجدّدیہ، کُندیاں، ضلع میانوالی، ۲۰۱۷ء) سے تقابل کیا تو دونوں کتابوں کے الفاظ میں کوئی فرق نہ پایا بلکہ ڈاکٹر رانجھا نے جو الفاظ قوسین میں لکھے ہیں وہ یہاں بھی قوسین میں ہی نقل ہوئے دیکھے۔ محض مثال کے لیے دیکھیے: حضرت شیخ عمر باغستانی اور شیخ خاوند طہور کے حالات (سیرت خواجہ احرار، ص ۳۵، ۳۴؛ رشحات مترجمہ رانجھا، ص ۳۶۳، ۳۶۵)۔ چند ایک مقامات پر حالات نگار نے رشحات مترجمہ رانجھا سے منقولہ مضمون میں معمولی پس و پیش کیا ہے یا کوئی ایک لفظ بدلا ہے، جیسے "بروقت منزل پر پہنچنا" (ص ۵۹؛ رشحات مترجمہ رانجھا، ص ۵۴۹) لیکن بنیادی ماخذ وہی ترجمہ ہے جس کا اخفا کیا گیا ہے۔ غرض اس کتاب میں خواجہ احرار کی سیرت کے باب میں اچھا خاصا مواد دوسروں کی تحقیق اور کاوش ہے جسے اپنی تحقیق اور تحریر کے نام پر پیش کیا گیا ہے۔ اگر کتاب کے مرتّبین نے ہر جگہ حوالہ دیا ہوتا تو یہ اخذ و اقتباس یا نقل کے زمرے میں آتا۔ موجودہ صورت میں نرم سے نرم الفاظ میں بھی اسے علمی سرقہ اور اصولِ استناد سے سراسر انحراف ہی کہا جا سکتا ہے۔ جو لوگ صوفیہ کے سلسلے سے وابستہ ہیں اور علما کہلاتے ہیں، ایسا علمی رویہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔

کتاب میں کچھ تاریخی تسامحات بھی ہیں۔ ایک جگہ خواجہ محمد یحیی (فرزند خواجہ احرار) کے تینوں بیٹوں خواجہ محمد زکریا، خواجہ عبد الباقی اور خواجہ محمد امین کو شہید بتایا گیا ہے (ص ۶۷) حالاں کہ صرف دو بڑے بیٹوں کو شہید کیا گیا، چھوٹے بیٹے خواجہ محمد امین کو قصداً شہید نہیں کیا گیا تھا کہ خواجہ یحیی بالکل ہی مقطوع النسل نہ ہو جائیں۔ اس سے متصل یہ جملہ ہے "یہ حضرت، ظہیر الدین بابر بادشاہ کے ساتھ سمرقند سے کابل میں گئے" (ص ۶۸)۔ اس جملے سے یہ معلوم نہیں ہوتا 'یہ حضرت' کس کی طرف اشارہ ہے؟ یہ دراصل خواجہ محمد امین کی طرف اشارہ ہے۔ رشحات سے جو مطالب ترجمہ کیے گئے ہیں ان میں سے بعض کو غلط سمجھا اور ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثلاً گرد ِراہ کا ترجمہ راستے کے کنارے کیا گیا ہے (ص ۶۰)۔ یہ دراصل فارسی کے ایک محاورے کو غلط سمجھنے کا شاخسانہ ہے۔ رشحات کا جملہ اور اس کا پس منظر اس طرح ہے: "از گرد ِراہ بہ منزل یکی از مخلصان... درآمدہ اند." یعنی خواجہ احرار حصار کے سفر سے جونہی ہرات واپس آئے ابھی پاؤں کی دھول بھی صاف نہیں ہوئی تھی کہ سیدھے اپنے ایک مرید کے گھر چلے گئے۔ آگے چل کر رشحات کے لفظ 'برنج' (چاول) کو مرچ ترجمہ کیا گیا ہے (ص ۶۱)۔

سیرت کے حصے میں متعدد مقامات پر کتابت کی غلطیاں موجود ہیں جیسے: بحرِ بے کنار کو بحرے کنار (ص ۲۰)، سہروردیہ کو سہرودیہ (ص ۲۱)، ریوگری کو یوگری (ص ۳۷)، انجیر فغنوی کو انچیر فغنوی (ص ۳۷)، رامیتنی کو رامتینی، (ص ۳۷)، اسرار التوحید کو اسرار التوحید و (ص ۵۱)،

مطبع مشہور عالم کو مطبع مشہوری عالم (ص ۵۲)، سیتل سنگھ کو سنیل سنگ (ص ۵۳)۔ ختلانی کو ہر جگہ اختلانی لکھا گیا ہے (ص ۶۸ دوبار، ۱۱۸)، اوبھی کو اوبی (ص ۶۸، ۶۹) اور اترازی کو اترائی (ص ۶۸)، فرکتی کو فرنگی (ص ۶۹)، شمسی کو شاماسی (ص ۶۹)، اوبھی سرپُلی کو اوبی سریلی (ص ۶۹ تین بار)، وخشی کو وحشی (ص ۶۹) اور یمنی کو عینی (ص ۶۹) لکھا ہے۔ مضمون نگار نے کئی مقامات پر خواجہ بہاء الدین عرف والدین نقشبند تحریر کیا ہے (ص ۳۷، ۳۸، ۹۶، ۹۷، ۱۲۲) عرف والدین سے کیا مراد ہے؟ بار بار برہان الدین بن آبریز لکھا ہے (ص ۱۲۲) اس میں "بن" زائد ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ فقرات کے اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں بتایا گیا ہے کہ یہ ترجمہ عارف نوشاہی کے مرتبہ فقرات (مطبوعہ ہرات) پر مبنی ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں فقرات کا فارسی متن دوبار شامل کیا گیا ہے، ایک طبع ہرات، دوسرا طبع تاشقند۔ پہلا متن وہ ہے جس کے سرورق پر ناشر کی طرف سے 'فقرات با تصحیح و مقدمہ دکتر عارف نوشاہی، انتشارات احراری، حرات' [کذا؛ صحیح: ہرات] لکھا گیا ہے۔ اولاً اس متن کے ساتھ عارف نوشاہی کا کوئی مقدمہ نہیں ہے لہذا 'با مقدمہ' لکھنا درست نہیں ہے، ثانیاً یہ عارف نوشاہی کی تصحیح اور انتشارات احراری بھی نہیں ہے۔ اگر کراچی کے معزز ناشر فقرات کا یہ متن ہو بہو عکسی شائع کرتے، جیسا تاشقند ایڈیشن کے سلسلے میں کیا ہے، تو اسے راقم السطور اپنی تصحیح اور انتشارات احراری کہہ سکتا تھا، لیکن معزز ناشر نے اس پورے حصے کی از سرِ نو کمپوزنگ کی ہے جس کی مجھے اطلاع دی گئی نہ مجھ سے اجازت لی گئی اور نہ ہی مجھ سے پروف پڑھوائے گئے! یہی وجہ ہے اس نئی کمپوزنگ میں نہ صرف غلطیاں ہیں (مثال: است کو اسبت لکھا ہے، ص ۵۷) بلکہ فونٹس کی خرابیاں بھی در آئی ہیں۔ ہر جگہ الف ممدودہ کی مدّ کی کرسی الف کے اوپر ہونے کی بجائے الف کے نیچے چلی گئی ہے۔ میں نے نہایت اہتمام سے متن میں اعراب لگائے تھے ان میں سے بعض کو نئی کمپوزنگ میں ختم کر دیا گیا ہے اور جو اعراب جدید کمپوزنگ میں لگائے گئے ہیں وہ ایسے فونٹ میں ہیں کہ حروف کے اندر دب گئے ہیں اور زیر زبر کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ جدید کمپوزنگ میں مفرد الفاظ کے حروف کے درمیان بے جا فاصلے دیے گئے ہیں (از کیا، ص ۲۹، بریدہ، ۲۹، مظہریت، ۲۹، بصیر تشان ۸۵)۔ یہ سب خرابیاں انتشارات احراری ایڈیشن میں نہیں ہیں اسی لیے کراچی ایڈیشن کو 'با تصحیح عارف نوشاہی' اور انتشارات احراری لکھنا سراسر خلاف واقع ہے اور مصحح اور ہراتی ناشر کی بدنامی کا باعث ہے۔ اگر ناشر اسے 'از روئے تصحیح عارف نوشاہی، انتشارات احراری' کمپوز شدہ بتاتے تو بات کچھ درست ہوتی۔

”صدیق مکرم“

ڈاکٹر شمس بدایونی
drshamsbadauni@gmail.com

اگر کوئی شخص آپ سے یہ سوال کرے کہ اردو کے چند بڑے مکتوب نگاروں کے ناموں کی نشاندہی کیجیے تو آپ ذہن پر زور دیے بغیر گویا ہوں گے: غالب، شبلی، آزاد، مہدی افادی وغیرہ۔ لیکن آپ سے یہ پوچھا جائے کہ اردو کا معروف مکتوب الیہ کون ہے، تو آپ کچھ توقف کریں گے اور اپنے حافظے کی چھلنی سے بہ ہزار مشقت صرف ایک ہی نام بر آمد کر سکیں گے: ”صَدِیق مکرم“۔[1]

اردو کا ہر طالب علم جب مولانا ابوالکلام آزاد (م:۱۹۵۸ء) کی 'غبارِ خاطر' سے آشنا ہوتا ہے تو وہ اس کے مکتوب الیہ ”صدیق مکرم“ حبیب الرحمن خاں شروانی (۱۸۶۷ء-۱۹۵۰ء) کے نام سے بھی واقف ہو جاتا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ ان کے علمی مرتبے اور سرمایۂ تصنیف و تالیف سے باخبر ہے یا نہیں۔

صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی، علوم دینیہ اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ کتاب دوست اور مخطوطہ شناس کے طور پر بھی معاصرین میں پہچان رکھتے تھے۔ ان کے مقاصدِ زندگی عظیم تھے، جس میں ان کی کارکردگی تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ ان کا علمی و ادبی مزاج اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہ ایک خاص نوعیت کا ذوقِ لطیف رکھتے تھے۔ اسی ذوقِ لطیف کے قدردان اور قتیل، اردو کے دو عظیم ادیب مولانا شبلی نعمانی (م:۱۹۱۴ء) اور مولانا ابوالکلام آزاد (م:۱۹۵۸) تھے۔ حسنِ اتفاق وہ (یعنی صدیق مکرم) اِن دونوں کے پسندیدہ مکتوب الیہ بھی ہیں۔ ان دو اکابر کے خطوط ہی سے ”صدیق مکرم“ کے ذوقِ لطیف کی نیرنگیوں سے ہم آگاہ ہو سکے ہیں۔

مولانا آزاد ۹؍ اگست ۱۹۴۲ء کو قلعۂ احمد نگر (مہاراشٹر) کی جیل میں سیاسی قیدی کی حیثیت سے

---

[1] یہ لفظ 'ص' پر زبر اور 'دال' پر زیر کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ صَدِیْق، جس کے معنی ہیں دوست۔ اسی کی ہم شکل اور ہم املا لفظ صِدّیْق ہے؛ 'ص' پر زیر 'د' مشدد؛ جس کے معنی ہیں سچا۔ اکثر لوگ اس لفظ کا تلفظ غلط کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ لفظ صِدّیق عام طور پر مستعمل ہے جب کہ صَدیق کا استعمال شاذ ہے۔

قید کر دیے گئے تھے۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں انھیں احمد نگر سے بانکوڑا جیل (مغربی بنگال) میں منتقل کر دیا گیا۔ یہیں سے وہ ۱۵/ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے۔ قید و بند کے دوران وقت گزاری اور اپنے تعلقِ خاطر نیز صحبت ہائے علمی کی یادوں کو زندہ اور خود کو ذہنی طور پر توانا رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے صدیق مکرم کو مخاطب تصور کر کے مختصر و طویل مضمون نما خیالی خطوط لکھے؛ جن میں زیرِ قلم باتیں اور خیالات عام خطوط کی روش سے مختلف اور جداگانہ تھے۔ ان خطوط کے موضوعاتی تنوع اور نیرنگیِ اسلوب نے اردو ادب کو، خطوط کے ایک نئے آہنگ سے متعارف کرایا۔

یہ خطوط شہرت و مقبولیت کے سبب جہاں مکتوب الیہ مولانا شروانی کی عزت و وقار میں اضافے کا موجب بنے وہیں مولانا آزاد کی ادبی شناخت کا بھی ایک نیا عنوان بن گئے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ یہ خطوط جیل کے ضابطوں کے مطابق مکتوب الیہ کو پوسٹ نہیں کیے جا سکے تھے اور رہائی کے بعد بھی یہ خطوط کی شکل میں انھیں بھیجے نہیں جا سکے بلکہ یہ انھیں مطبوعہ صورت میں ملے، اگرچہ مولانا آزاد کا ارادہ ان خطوط کو شائع کرنے کا نہیں تھا۔ اس مرموز صورت حال کو بیان کرتے ہوئے جیل سے رہائی کے بعد ایک خط (مکتوبہ ۳/ ستمبر ۱۹۴۵ء) میں خود مولانا آزاد لکھتے ہیں:

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا وہ ۳/ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا... اب دنیا سے تمام علاقے منقطع ہو چکے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے... اچانک وہ خط جو ۳/ اگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا یاد آ گیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف رہے۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے اور تیسرے دن مکتوب قلم بند ہوتے رہے... ۱۰/ اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا... ۱۵/ جون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا تو تمام مکتوب نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیے۔ خیال تھا کہ انھیں حسب معمول نقل کرنے کے لیے دے دوں گا، اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا، تو وہ بہت مصر ہوئے کہ اِنھیں بلا تاخیر اشاعت کے لیے دے دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک خوش نویس کو شملہ میں بلایا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے اور امید ہے عنقریب طباعت کے لیے پریس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اب میں ان مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی

صورت میں نہیں بھیجوں گا، مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا۔

۔۔۔مکتوبات کے دو حصے کر دیے ہیں: غیر سیاسی اور سیاسی [۲]۔ یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثنا آپ کے نام لکھے گئے ہیں۔ [۳]

مئی ۱۹۴۶ء کے آغاز میں صدیق مکرم کو 'غبار خاطر' کے دو مطبوعہ نسخے موصول ہوئے۔ ۴/ مئی کے مکتوبہ خط میں وہ اس کی رسید اس طرح دیتے ہیں:

اسی عرصہ میں دو نسخے [۴] 'غبار خاطر' کے نور افزا ہوئے۔ غبار اور نور افزائی! ہاں نور افزائی غبار تھا، کوئے دوست کا۔ آنکھوں سے لگایا۔ پڑھا، پڑھوں گا۔ زہے قسمت کہ گوشۂ تنہائی میں انیس صحبت حبیب رہا۔ بزم اُنس اس قدر طویل کہ ایک مجلد کا سامان تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ تاریخی واقعہ بنے گا۔ [۵]

'غبارِ خاطر' کو مولانا آزاد کے سکریٹری محمد اجمل خاں (م: ۱۹۶۹ء) نے مع مقدمہ مرتب کیا تھا، اور یہ نسخہ پہلی بار مولانا آزاد کے یک صفحی دیباچے (مکتوبہ ۲/ فروری ۱۹۴۶ء) کے ساتھ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے مئی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ دوسری اشاعت یہیں سے اگست ۱۹۴۶ء میں اور تیسری فروری ۱۹۴۷ء میں مکتبہ احرار لاہور سے شائع ہوئی۔ شروع کی دو اشاعتوں میں قید کے دوران لکھے گئے کل بیس خط شامل تھے۔ جن کی مدتِ مکاتبت ۳/ اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۵/ جون ۱۹۴۳ء تھی۔ تیسری اشاعت میں ایک خط کا مزید اضافہ ہوا۔ یہ خط دوران اسیری ہی کا تھا جو موسیقی سے متعلق تھا، مکتوبہ ۱۶/ ستمبر ۱۹۴۳ء۔ یہ کسی سبب پہلی اشاعت میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ ان اشاعتوں میں تین خط رہائی کے بعد کے تھے: مکتوبہ ۲۷/ جون، ۲۴/ اگست اور ۳/ ستمبر ۱۹۴۵ء۔ یہ تینوں خط مع جواب نواب صدر یار جنگ (دو خط)، ان تینوں اشاعتوں میں شامل رکھے گئے۔ ترتیب میں انھیں جملہ خطوط سے مقدم رکھا گیا ہے۔ رہائی کے بعد کے یہ تینوں خط مع جواب، اختلاف متن کے ساتھ

---

[۲] مولانا آزاد کے قید کے دوران لکھے جانے والے سیاسی خطوط کی اشاعت شاید آج تک نہیں ہو سکی۔

[۳] غبارِ خاطر: ۶۔۱۰۔

[۴] مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں مولانا حبیب الرحمٰن کلکشن اور مولانا آزاد کلکشن موجود ہے۔ میں نے ان میں مولانا آزاد کے بھیجے ہوئے ''غبار خاطر'' کے نسخے تلاش کرنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر مجھے یہ نہیں مل سکے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان نسخوں کے سرورق پر دستخط کے ساتھ مولانا آزاد نے کیا کوئی عبارت یا شعر بھی لکھا ہے؟

[۵] کاروانِ خیال، ص: ۱۴۰۔

کاروانِ خیال (بجنور سنہ ندارد، دسمبر ۱۹۴۶ء[۶]) میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

ایک عرصے تک 'غبارِ خاطر' کی نقول طبع سوم کے متن پر منحصر رہیں۔ اور اس کے اصل اور جعلی نسخے کثرت سے شائع ہوتے رہے۔ موجودہ دور میں مالک رام (م: ۱۹۹۳ء) کا مرتبہ نسخہ متداول ہے، جسے پہلی بار ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا اور وہ چوتھی بار ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں آزاد کے ۲۴ خطوط ہیں۔ اس نسخے میں محمد اجمل خاں کا مقدمہ اور مکتوب الیہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے خطوط کو حذف کردیا گیا ہے۔ نیا مقدمہ خود مرتب مالک رام نے لکھا ہے اور تخریج وحواشی کا اہتمام کیا ہے۔ البتہ خطوط پر جو عنوانات سابقہ اشاعتوں میں دیے گئے تھے انھیں برقرار رکھا گیا ہے۔ وہ عنوانات یہ ہیں:

خط نمبر ۲ مکتوبہ ۲۴/ اگست ۱۹۴۵ء مکتوب سری نگر

خط نمبر ۳ مکتوبہ ۳/ ستمبر ۱۹۴۵ء مکتوب نسیم باغ

خط نمبر ۴ مکتوبہ ۳/ اگست ۱۹۴۲ء مکتوب سفر

خط نمبر ۵ مکتوبہ ۱۰/ اگست ۱۹۴۲ء داستان بے ستون و کوہ کن

خط نمبر ۹ مکتوبہ ۷/ اگست ۱۹۴۲ء حکایت بادہ وتریاک

خط نمبر ۱۸ مکتوبہ ۲/ مارچ ۱۹۴۳ء حکایت زاغ وبلبل

خط نمبر ۱۹ مکتوبہ ۷/ مارچ ۱۹۴۳ء چڑیا چڑے کی کہانی

پتے اور تاریخ کے اندراج کے بعد یہ تمام خطوط 'صدیق مکرم' کے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ 'غبارِ خاطر' کے علاوہ 'کاروانِ خیال' میں شامل خطوط میں بھی 'صدیق مکرم' ہی کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ یہ دونوں مجموعۂ مکاتیب ۱۹۴۶ء ہی میں آگے پیچھے شائع ہوئے۔ تفصیل آیندہ سطور میں پیش کی جائے گی۔

یہ خطوط جہاں مکتوب نگار کی علمی وسعت، ذہنی تنوع، مشاہدے اور تجربے کی انفرادیت اور

---

[۶] کاروان خیال میں سالِ اشاعت کا اندراج نہیں۔ مقدمے کی ایک عبارت "غبار خاطر اور کاروانِ خیال" ۶۵ھ میں شائع ہوئیں۔ آخر الذکر میں ۶۵ھ کا مکتوب بھی شامل ہے"۔ ص: ۳۳ کی بنیاد پر ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء کا سن اشاعت طے کیا۔ اسی کتاب میں مقدمہ نگار کی ایک عبارت، مکتوبہ یکم نومبر ۱۹۴۶ء سے پتہ چلتا ہے کہ کاروانِ خیال کا پروف یکم نومبر تک تیار ہوچکا تھا (ص: ۱۴۳)۔ اسی داخلی شہادت کی بنیاد پر ماہِ دسمبر میں اس کی اشاعت کا قرینہ لگایا گیا۔

اسلوب کی رنگارنگی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہیں ان کے مخاطب یعنی مکتوب الیہ کے بھی علمی وادبی ذوق اور ذہنی معیار کا پتہ دیتے ہیں۔

غبارِ خاطر میں شامل خطوط کے متفرق موضوعات یہ ہیں: تاریخ، فلسفہ، اسلامی افکار و مسائل، نجی زندگی کے احوال ومشاغل، اظہارِ انانیت وانفرادیت، موسیقی، چائے نوشی اور بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں کو قوت متخیلہ اور منفرد اسلوب کے ذریعے متشکل کرنا مثلاً حکایت زاغ وبلبل اور چڑیا چڑے کی کہانی وغیرہ۔ انھیں خوبیوں اور تقریباً تین سال کے طویل وقفے کے بعد مولانا آزاد کی نئی تحریروں تک رسائی کے سبب 'غبار خاطر' کی پہلی اشاعت ہاتھوں ہاتھ تین ماہ ہی میں نکل گئی۔

اسی سال اگست ۱۹۴۶ء میں اس کی دوسری اور فروری ۱۹۴۷ء میں تیسری اشاعت منظر عام پر آئی۔ قارئین آزاد کا مطالبہ تھا کہ اسیری سے قبل کے خطوط بھی اگر موجود ہوں تو شائع کیے جائیں۔ حسنِ اتفاق کچھ خطوط موجود تھے۔ چنانچہ سید الطاف علی بریلوی (م:۱۹۸۶ء) سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ اور محمد عبدالشاہد خاں شروانی (م:۱۹۸۴ء) کی کوشش سے مولانا آزاد اور مولانا شروانی نے خطوط کی نقول فراہم کیں اور اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ محمد عبدالشاہد خاں شروانی نے انھیں مرتب کیا اور طویل مقدمہ لکھا (مکتوبہ ۱۲/اکتوبر ۱۹۴۶ء)۔ اس طرح یہ خطوط 'کاروانِ خیال' کے نام سے مدینہ پریس بجنور سے دسمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے۔ اس میں مولانا آزاد کے ۱۷/ اور مکتوب الیہ مولانا شروانی کے دس خط شامل ہیں۔ مکاتبت کا یہ دور ۴/ستمبر ۱۹۴۰ء سے ۱۲/نومبر ۱۹۴۶ء کو محیط ہے۔ ان دونوں کے درمیان مراسلت کا یہ ایک ایسا مجموعۂ خطوط ہے جو خیالی یا تصوراتی نہیں بلکہ یہ سماجی اور اخلاقی ضرورت کے تحت لکھے گئے برجستہ اور قلم برداشتہ خطوط ہیں، جو غبار خاطر کے مقابلے میں مختصر ہیں۔ ان خطوط نے دونوں کی علمی حیثیت، افتادِ طبع، ذہنی معیار، پسند وناپسند اور دوستانہ اخلاص کو ہویدا کر دیا ہے۔ اس طور مولانا آزاد کے مولانا شروانی کے نام خطوط کی تعداد (۲۱+۱۷=۳۸) ہو جاتی ہے، جبکہ مولانا شروانی کے صرف دس ہی خط مولانا آزاد کے نام شامل ہیں۔

مولانا آزاد اپنی عادت کے مطابق خطوط میں فارسی، اردو اور عربی کے اشعار و مصرعے کچھ اس طرح سے لکھتے یعنی پیوست کر دیتے ہیں کہ گویا وہ خاص اسی موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔ 'غبارِ خاطر' میں انھوں نے کم وبیش سات سو شعر نقل کیے ہیں۔ 'کاروانِ خیال' میں بھی یہ روش برقرار رہی۔ چنانچہ ۱۷ خطوط میں کم وبیش ۶۱ شعر اور ۲۰ مصرعے نقل کیے گئے ہیں۔ تین خط

صرف ایک ایک شعر سے مکمل کر دیے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا شروانی یعنی صدیق مکرم نے بھی اپنے جواباتِ خط میں اشعار کے دفتر کھول دیے۔ آزاد کے نام دس خطوط میں کم و بیش ۵۴ شعر اور ۶ مصرعے نقل کیے ہیں اور فارسی میں ایک نامۂ منظوم بھی لکھا ہے۔

مولانا شروانی نے اپنے کم عمر دوست آزاد کے لیے صدیق حبیب، مکرمِ حبیب، مکرمِ حبیب، صدیق حمیم، حبیب نواز، آشنا پرور، کرم طراز، صدیق حبیب بہ دل قریب، صدیق مکرم کے مکرم باکرامت، القاب استعمال کیے اور خط کے آخر میں اپنے نام کے اندراج سے پہلے: نیاز نشان، نیاز کیش اور اسیر آزاد الفاظ تحریر کیے حالانکہ وہ مولانا آزاد سے عمر میں ۲۱ سال بڑے تھے۔

مولانا آزاد طول نویس تھے۔ خطوط بھی کبھی انتہائی مختصر اور کبھی خاصے طویل لکھتے تھے جن میں ہر طرح کی بات ہوتی، لیکن مولانا شروانی اپنے جواب میں اختصار و جامعیت کو ملحوظ رکھتے اور وقار و متانت بھی ان کے پیش نظر رہتی۔ کہیں کہیں تکلف بھی محسوس ہوتا۔ شاید آزاد سے عمر میں بڑے ہونے کا احساس تھا۔ ان دونوں کے خطوط کا اگر تقابل کیا جائے تو طرزِ تحریر میں آزاد سے کم تر نہ ہوتے ہوئے بھی خطوط آزاد پر ان کو کسی بھی طور فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان حقیقی خطوط کے مقابلے 'غبار خاطر' کے تخلیقی خطوط کو قبول عام حاصل ہوا اور غالب کے خطوط کے بعد اسی کے سب سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ "کاروان خیال" کے پچھلے ۶۷ سالوں میں صرف دو اشاعتیں ہی منظر عام پر آسکیں۔ دوسری اشاعت ڈاکٹر عطا خورشید کی اطلاع کے بموجب نسیم بک ڈپو لاہور (سنہ ندارد) سے ہوئی۔ تیسری اشاعت کی راہ شاید آئندہ ہموار ہو جائے۔

مولانا آزاد کے بعد علامہ شبلی نعمانی کے بھی سب سے بڑے اور اہم مکتوب الیہ مولانا شروانی ہی ہیں۔ مکاتیب شبلی جلد ۱ (اعظم گڑھ، طبع اول ۱۹۱۶ء) میں صدیق مکرم حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ۱۱۸ خط ہیں۔ خطوط شبلی بنامِ شروانی مرتبہ فیصل احمد ندوی (دہلی ۲۰۲۰ء) میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۶۰ ہو گئی ہے۔ یہ مجموعۂ خطوط، شبلی کے مکاتیب کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو تدوین کے اعلیٰ درجہ کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر مدون کیا گیا۔ تدوین کے طریقۂ کار کے لحاظ سے اس کے جائزے کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ مولانا شبلی کے اب تک جو خطوط دریافت ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑی تعداد صدیق مکرم کے نام خطوط ہی کی ہے۔

صدیق مکرم کے نام شبلی کے خطوط کا دورانیہ ۸/ فروری ۱۸۹۹ء سے ۱۶/ ستمبر ۱۹۱۴ء ہے۔ ان میں شبلی انھیں بیشتر مکرمی، مخدومی اور کمتر جناب من کے القاب سے مخاطب کرتے ہیں۔ خط کے

آخر میں نام کے اندراج سے پہلے صرف والسلام یا والتسلیم لکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ بیشتر خط القاب سے خالی ہیں۔ ان دونوں علمی شخصیتوں کے درمیان جو اتحاد تھا اور ان کی مراسلت کے جو مضامین تھے ان کا لفظوں میں احاطہ کرنا دشوار ہے۔ سید سلیمان ندوی (م:۱۹۵۳ء) نے ”حیاتِ شبلی“ میں ان خطوط کے مضامین کو ایک پیراگراف میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہاں اسی کو نقل کر دینا مناسب ہو گا:

تعلقات کی شگفتگی کا اندازہ ان مراسلتوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ ہو سکتا ہے جو دونوں دوستوں میں باہم ہوئی ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں فارسی میں غزلیں کہتے ہیں اور مولانا کی خدمت میں بھیجتے ہیں۔ وہ ان کے ٹوکنے پر تغیر و تبدل کرتے ہیں۔ مولانا کی تصنیفات پر ریویو لکھتے ہیں اور مولانا داد دیتے ہیں۔ ان کے زورِ تحریر کو دیکھ کر مولانا کو مضمون نگاری کا میدان تنگ نظر آتا ہے اور ایک مستقل تصنیف کا مشورہ دیتے ہیں۔ ایک مشترک کتاب کی تصنیف کی تجویز ہوتی ہے جس کا نام ’حبیبِ شبلی‘ تجویز کیا جاتا ہے۔ تصنیفی مشورے ہوتے ہیں اور مولانا اس کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ مولانا علیل ہوتے ہیں تو ان سے حکیم عبدالمجید خاں کے نام خط لکھواتے ہیں۔ غسل صحت کے بعد ایک جلسۂ دعوت ترتیب دیتے ہیں تو ان کو خصوصیت کے ساتھ مدعو فرماتے ہیں۔ ندوہ میں جو اہم معاملات پیش آتے ہیں اُن میں اِن کی اعانت کے محتاج ہوتے ہیں۔ نادر اور بیش قیمت کتابیں نظر سے گزرتی ہیں تو ان کو خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کے لیے کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے تو بلا تکلف ان کے کتب خانے سے منگواتے ہیں۔ اپنا کتب خانہ فروخت کرنا چاہتے ہیں تو اس راز کی صرف انھیں خبر دینا چاہتے ہیں۔ غرض ان گوناگوں تعلقات کی بنا پر وہ مولانا کے دوست بھی تھے، ممنون مشورہ بھی تھے، محسن بھی تھے اور ایک عزیز بھائی بھی تھے۔[۷]

غرض کہ مکتوب الیہ کی حیثیت سے صدیق مکرم اردو کے وہ واحد ادیب ہیں جو شہرت سے مقبولیت اور مقبولیت سے عظمت تک کا سفر طے کر چکے ہیں۔

خاکسار نے اس مضمون میں خطوط سے مثالیں دینے سے گریز کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ”غبار خاطر“ کی اکثر عبارتیں شیدائیانِ اردو کو ازبر ہیں یا ان کے حافظے کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔ تبرکاً دونوں مکتوب نگاروں کے خطوط سے محض ایک ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

---

[۷] حیات شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص:۷۹۶- ۷۹۷۔

مولانا شروانی ایک خط میں سفر اعظم گڑھ کے ارادے کا اظہار کرتے ہیں۔ شبلی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

کیا آپ واقعی یہاں جلوہ فرما ہوں گے اور کیا درحقیقت:

میرے ویرانے میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی

نامۂ والا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں:

سچ سچ بتا یہ حرف انھیں کے قلم کے ہیں

شبلی

(۲۵/جون ۱۸۹۹ء)

۲۶/اکتوبر ۱۹۴۰ء کے مکتوبہ ایک خط میں مولانا آزاد صدیق مکرم کو لکھتے ہیں:

علامہ مرحوم (شبلی نعمانی) کی یاد میں آپ کو کتنا برمحل شعر یاد آیا...فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگارنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی...وہ کیا گئے علم و فن کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہو گیا...ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملّایانہ طلب علم کے، ملائیت کی پرچھائی بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ خشکی طبع جو اس راہ کے مہالک و آفات میں سے ہے انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان کے حصے میں آیا تھا اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں ان پر ختم ہوئی"[۸]

علم و ادب کے اِن تین احباب ثلاثہ: شبلی، شروانی اور آزاد میں شروانی محققین کے التفات سے محروم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں نایاب نہیں تو کمیابی کی حدود میں داخل ضرور ہو چکی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کی دریافت و بازیافت کی جائے۔

زیر نظر مضمون میں مکتوب الیہ کی حیثیت سے ان پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ مکتوب نگار کی حیثیت سے مولانا شروانی کا مکتوباتی ادب میں ابھی شمار نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کے خطوط کی عدم دستیابی رہی۔ ان کے مطبوعہ صرف دس خطوط ہی "کاروانِ خیال" (بجنور ۱۹۴۶ء) میں شائع ہو کر حافظے سے محو ہو گئے۔ بعد میں نقوش لاہور کے مکاتیب نمبر اور معارف کے شماروں میں بعض خطوط نظر آئے، لیکن یہ کتابی صورت حاصل نہیں کر سکے۔

---

[۸] کاروانِ خیال، ص: ۹۳-۹۴۔

ڈاکٹر فخر عالم ندوی نے اپنی مرتبہ کتاب ''مکاتیبِ مشاہیر بنام نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی'' (۲۳مشاہیر کے ۱۱۴خط، مطبوعہ دہلی ۲۰۲۳ء) میں انھیں بھی جمع کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ۳۹مشاہیر کے نام مولانا شروانی کے ۱۲۵ خطوط شامل کیے ہیں، جن کا دورانیہ ۴/جنوری ۱۹۰۲ء تا ۴/جون ۱۹۴۹ء ہے۔ اس مجموعہ خطوط میں مولانا آزاد کے نام ۱۱خطوط شامل ہونے سے رہ گئے۔ ۱۰/خط ''کاروانِ خیال'' میں شامل ہیں اور ایک خط (مکتوبہ یکم اگست ۱۹۴۷ء) ''مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط وجوابات آزاد'' مرتبہ محمد اجمل خاں (یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۶ء) میں شامل ہے (ص:۱۰۱)۔ اس کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اگر یہ خطوط شامل کر لیے گئے تو صدیق مکرم حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے دستیاب خطوط کی تعداد ۱۳۶ ہو جائے گی۔ امید ہے کہ مستقبل قریب میں تاریخ خطوط نگاری کے مطالعے کے دوران ان خطوط پر بھی امید افزا گفتگو ہو گی۔

صدیق مکرم کا ایک نو دریافت خط بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:

یکم اگست ۱۹۴۷ء

مکرم با کرامت صدیق مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شکر کرامت و کرامت تامّہ۔ میرے یہاں دو نسخے قلمی دیوان بلکہ کلیات عرفی کے ضخیم حاوی اقسام کلام ہیں: ایک معمولی خط کا، دوسرا نادر نمونہ، قلمی کتاب کا۔ اس میں دیباچہ بھی ہے۔ مفید معلومات سے مملو ہے۔ خان خاناں کے اہتمام سے کلیات مدون ہوا تھا۔ سراج محمد قاسم نے حسب ہدایتِ موصوف مدون کیا۔ یہ نسخے طباعت کے لیے بنیادی نسخے کا کام دے سکتے ہیں۔ بہترین کام۔ یہ اشاعت فارسی ادب کی گراں بہا خدمت ہو گی۔ افسوس ہے کہ فارسی ادب کا ذوق ملک وملت سے رخصت ہو رہا ہے۔

والسلام بالا کرام

حبیب الرحمٰن خاں احسن[9]

مذکورہ بالا خط بہت سادہ سا ہے، 'کاروانِ خیال' میں شامل مولانا شروانی کے خط زبان وبیان کی شگفتگی وچاشنی لیے ہوئے ہیں۔ ان خطوط سے دو اقتباس نقل کرتا ہوں:

---

[9] نام کے بعد احسن لکھا گیا ہے جو بہ ظاہر تخلص معلوم ہوتا ہے، حالانکہ مولانا کا تخلص حسرتؔ تھا اور اسی تخلص کی رعایت سے ان کے دو دیوان کاروانِ حسرت اور بوستانِ حسرت بھی شائع ہو چکے ہیں، لہٰذا یہ لفظ احسن غالباً کاتب کی غلطی سے مرقوم ہو گیا۔

شعر العجم میں علامہ مرحوم نے شیخ (حزیں) کو نہیں مانا۔ میں نے ٹوکا! ایک بار سے زیادہ بنارس میں مزار شیخ دیکھا ہے اور اس کو غزل فارسی کا مدفن محسوس کیا ہے۔

تیسری یاد علامہ شبلی مرحوم کی۔ آپ کے پُر شوق الفاظ نے آتشِ شوق تیز کر دی۔ اسی زمانے میں ایک طُرفہ اتفاق پیش آیا۔ مدت دراز کے بعد 'رباعیات سحابی نجفی' کا ایک عمدہ قلمی نسخہ ہاتھ آگیا۔ رباعیات کے متعلق تلاش شروع ہوئی۔ کس قدر ہیں؟ کہاں کہاں ہیں؟ کسی نے یاد دلایا کہ ستمبر ۱۹۰۷ء میں الندوہ میں مولانا نے ایک مضمون سحابی پر شائع کیا تھا۔ الندوہ دیکھا۔ اسی ضمن میں ایک دوسرے مضمون میں ایک دوآتشہ جام، نگاہِ شوق میں چھلک گیا۔ مآثر رحیمی کے طبع ہونے کا شوق ظاہر فرمایا گیا ہے۔ اس ضمن میں چار نام زبان قلم پر آئے، چوتھا نام میرا تھا۔ اس عنوان سے 'حبیب صادق' جوش کیف میں جھوم گیا۔ حضرت میر درد کا شعر یاد آیا۔ کیف دوبالا ہو گیا:

دو پیالے جس کو آنکھوں نے تیری پلا دیے   دونوں جہان کی نہ رہی پھر خبر اسے

مولانا کے دونوں لفظ دو پیالے تھے، بلکہ دو خم نہیں دو میخانے۔ آج تک جب یاد آتے ہیں سرشار نیاز کر دیتے ہیں[۱۰]۔

حبیب نواز، آشنا پرور، کرم طراز السلام علیکم و قلبی لدیکم

کل جان پرور نامہ پہنچا۔ دیکھ کر دل فرط شوق سے تڑپ گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا:

از یار آشنا سخنِ آشنا شنید   بوئے خوشِ تو ہر کہ زِ بادِ صبا شنید

زیبِ نامہ صرف ایک سطر تھی مگر ایک دفتر محبت اس میں بھرا ہوا تھا۔ محبت نہ ہو تو شکوۂ ناآشنائی کیوں ہو! جو شکوہ خبرِ محبت دے، اس پر سو شکر قربان۔[۱۱]

اِن احباب ثلاثہ کے دستیاب خطوط کی تعداد اور مدت مکاتبت کا نقشہ حسب ذیل ہے:

مولانا آزاد: تعداد خطوط ۳۸   دور مکاتبت - ۴/ ستمبر ۱۹۴۰ء تا یکم نومبر ۱۹۴۶ء

مولانا شبلی: تعداد خطوط ۱۶۰   دور مکاتبت - ۸/ فروری ۱۸۹۹ء تا ۲۶/ ستمبر ۱۹۱۴ء

مولانا شروانی: تعداد خطوط ۱۱   دور مکاتبت - ۱۳/ اکتوبر ۱۹۴۰ء تا یکم اگست ۱۹۴۷ء

مذکورہ بالا خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں اکابر کے یہاں جو خصوصیات

---

[۱۰] کاروانِ خیال: ۹۷-۹۸۔

[۱۱] کاروانِ خیال: ۱۰۳۔

قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- تینوں کتاب دوست اور مخطوطہ شناس، نئی مطبوعات، نایاب و نادر قلمی کتب کے شیدائی اور خریدار۔

۲- تینوں اعلیٰ درجہ کا شعری مذاق رکھنے والے اور فارسی و عربی شعریات کے واقف کار۔

۳- تینوں کا حافظۂ اشعار بے مثل، جہاں جیسی ضرورت ہوئی شعر چسپاں کر دیا۔

۴- تینوں باوقار و تمکین، اخلاص کے ساتھ تعلق کو استوار رکھنے والے۔

۵- تینوں ایک دوسرے کی شخصیت اور علمی فتوحات کا دل سے اعتراف اور اس پر فخر کرنے والے۔

۶- تینوں چائے کے شوقین اور چائے کو بڑے سلیقے اور اہتمام سے پینے والے۔

۷- تینوں، خطوط کے ذریعے مجلسی صحبت و ملاقات کا لطف لینے والے۔

۸- تینوں خط کو صرف اطلاع و خبر اور خیر و خیریت تک محدود نہ رکھتے ہوئے اسے اپنے پُرزور و پُراثر قلم سے ایک نثر پارہ بنا دینے والے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جو سرسری مطالعے کے دوران قاری محسوس کر لیتا ہے۔ اگر ان خطوط کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو چند اور خصوصیات بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔

'غبار خاطر' کے دیباچے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

یہ تمام مکاتیب نج کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائیں گے، لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خاں صاحب کو ان کا علم ہوا، تو مصر ہوئے کہ انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چونکہ اُن کی طرح اُن کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے، اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سروسامان کر رہا ہوں؛ جس حالت میں قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے، اسی حالت میں طباعت کے لیے دے دیے گئے ہیں، نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا[۱۲]۔

لیکن وہ خطوط جو ''غبار خاطر'' اور ''کاروان خیال'' میں مشترک ہیں، ان کے ملان کرنے سے مولانا آزاد کا یہ بیان کہ ''ان پر نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا'' غلط ٹھہرتا ہے۔ مالک رام نے اپنے مرتبہ نسخے میں تخریج و حواشی کا خاصا اہتمام کیا لیکن حیرت ہے کہ متن کا ملان کرنے میں ان سے کیونکر چوک ہو گئی؟

''غبار خاطر'' میں تین خط مولانا آزاد کے اور (شروع کی تین اشاعتوں میں) دو خط مولانا شروانی

---

[۱۲] غبارِ خاطر، ص:۱-۲، طبع چہارم

کے ہیں۔ ان پانچوں خطوط کے متن میں جگہ جگہ تصحیح واضافے اور ترمیم کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی جملہ تفصیلات و مباحث سے گریز کرتے ہوئے بلا تبصرہ و تنقید "غبار خاطر" اور "کاروان خیال" سے صرف ایک خط مکتوبہ ۲۴/ اگست ۱۹۴۵ء بہ عنوان 'مکتوب سری نگر'[۱۳] نقل کیا جارہا ہے:

مکتوبِ سرینگر

ہاؤس بوٹ، سرینگر

۲۴/ اگست ۱۹۴۵ء

گہے از دست، گاہے از دل وگاہے زپامانم
بسرعت می روی اے عمر! می ترسم کہ وامانم

صدیقِ مکرم

زندگی کے بازار میں جنسِ مقاصد کی بہت سی جستجوئیں کی تھیں، لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں، یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈھ رہا ہوں۔ معالجوں نے وادیِ کشمیر کی گل گشتوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ گذشتہ ماہ کے اواخر میں گلمرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سراغ پاسکوں گا، مگر ہر چند جستجو کی، متاعِ گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا!

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضیؔ نے کبھی بارِ عیش کھولا تھا:

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن میرے حصے میں ناخوشی و علالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پر اٹھائے آیا تھا، اسی طرح اٹھائے واپس جارہا ہوں۔ خود زندگی بھی سرتاسر ایک بوجھ ہی ہے، خوشی سے اٹھائیں یا ناخوشی سے؛ مگر جب تک بوجھ سر پر پڑا ہے، اٹھانا ہی پڑتا ہے:

مازندہ ازانیم کہ آرام نگیریم

گلمرگ سے سرینگر آگیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا

---

(۱۳) یہ دو خط ہیں جو دو مختلف تاریخوں میں لکھے گئے ہیں۔ قریب قریب لکھے جانے کی وجہ سے دونوں کے موضوعات میں تشابہ ہے (مدیر)

کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوبِ منظوم حوالہ کیا، کہہ نہیں سکتا کہ اس پیامِ محبت کو دل درد مند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے، جو غالب نے کہا تھا:

باچوں توئی معاملہ، برخویش منت ست
از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیانِ دلنواز نہیں بھیجا ہے، لطف وعنایت کا ایک پورا دفتر کھول دیا ہے:

قلیل منک یکفینی ولکن
قلیلک لا یقال لہ قلیل

ان سطور کو آئندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصور کیجیے۔ رہائی کے بعد جو کہانی سنانی تھی، وہ ابھی تک نوکِ قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابو الکلام [۱۴]
نسیم باغ، سرینگر (کشمیر)
۲۶/ اگست ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم! زندگی میں بہت سی جستجوئیں کی تھیں لیکن اب ایک نئی جستجو پیچھے لگ گئی ہے یعنی اپنی گم شدہ صحت کا سراغ ڈھونڈ رہا ہوں۔

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

اطباء نے کشمیر کی وادیوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ گلمرگ پہنچا اور تقریباً تین ہفتے وہاں بسر کیے، لیکن گم شدہ صحت کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب سرینگر آگیا ہوں اور ہاؤس بوٹ میں نسیم باغ کے پاس مقیم ہوں، فیضی نے یہاں بارِ عیش کھولا تھا:

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

میرے حصہ میں ناخوشی وعلالت کا بوجھ آیا۔ اسے سر پر اٹھائے یہاں آیا تھا اور سر پر اٹھائے واپس جاؤں گا۔ یہ کشمیر کی جان پرور آب وہوا کا قصور نہیں ہے۔ میرے جسم ناساز گار کا قصور ہے۔

---

[۱۴] غبارِ خاطر، طبع دوم، ص: ۴-۵

ہرچہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست

ہرچہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست

ورنہ تشریفِ تو بربالائے کس دشوار نیست

۱۹ر کو جب گلمرگ سے سرینگر آرہا تھا تو راہ میں ڈاک کھولی اور آپ کا نامہ منظوم ملا۔ کیا عرض کروں کس درجہ طبیعت متاثر ہوئی۔ سرتاپا شکر گذار اور ہمہ تن رہین منت ہوں۔

قلیل منک یکفینی ولکن
قلیلک لا یقال لہ قلیل

یہ خط آپ کے نامۂ منظوم کی رسید ہے مجھے جو کچھ لکھنا ہے اس کے لیے مہلت کا انتظار کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ ایک دو دن کے اندر کسی نہ کسی طرح وقت نکالوں گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی
حبیب گنج (علی گڑھ)[۱۵]

یہاں یہ اشکال کیا جاسکتا ہے کہ تصحیح وترمیم، ”کاروانِ خیال“ میں کی گئی ہوگی، ”غبارِ خاطر“ میں نہیں۔ لیکن یہ خیال اس لیے درست نہیں ہو سکتا کہ ”کاروانِ خیال“ کی عبارت کے مقابلے ”غبارِ خاطر“ کی عبارت زیادہ شگفتہ، رواں اور ادبیت لیے ہوئے ہے، لہٰذا اس اصلاح کو مولانا آزاد سے متعلق کرکے دیکھنا ہی صحیح ہوگا۔ مجھے علم نہیں کہ اب سے پہلے اس تحریف کی نشاندہی کسی نے کی یا نہیں؛ بہرحال اپنے آپ میں یہ ایک قابلِ توجہ مسئلہ ہے جس پر گفتگو کی جانی چاہیے۔

---

[۱۵] کاروانِ خیال، ص: ۱۲۹۔ ۱۳۰

عہد نبویؐ میں رقیہ اور جلدی امراض کی ماہر صحابیہ

الشفاء بنت عبد اللہ العدویۃ القرشیۃ

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی

jamiljh04@gmail.com

عہد نبویؐ میں کئی ایسی خواتین تھیں جن کی خصوصیات کی بنیاد پر آج بھی انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ شجاعت و بہادری، فراست و سمجھ داری، ذہانت و ذکاوت، تعلیم و تعلم، اخلاق و کردار، حتی کہ علاج و معالجہ میں بھی بعض خواتین نے وہ نمایاں کارکردگی دکھائی کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان کی تعریف کی۔ انھیں خواتین میں سے ایک الشفاء بنت عبد اللہ العدویۃ القرشیۃ ہیں۔ حافظ ابن عبد البر ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "وہ عاقل و فاضل خواتین میں سے تھیں، رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آتے اور ان کے گھر میں قیلولہ فرماتے۔ انھوں نے آپ ﷺ کے لئے ایک بستر اور ایک ازار رکھا ہوا تھا، جس میں آپ آرام فرماتے تھے"[1]۔

ان کا شمار قریش کی ان معدودے چند خواتین میں ہوتا تھا جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ احمد خلیل جمعہ لکھتے ہیں: "شفاء رضی اللہ عنہا ان عورتوں اور قریشیات میں سے تھیں، جنھیں لکھنا پڑھنا آتا تھا- اور یہ بہت کم تھیں- جس کی وجہ سے اپنی قوم میں انھیں شہرت حاصل تھی اور اسی سبب سے انھوں نے اپنے زمانہ کے علوم رقیہ، طب اور ان سے متعلق اسرار و رموز سے بھی واقفیت حاصل کی تھی"[2]۔

وہ رقیہ اور جلدی امراض کی ماہر سمجھی جاتی تھیں، جس کا نتیجہ تھا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا: "کیا تم یہ نملہ (ایک قسم کی جلدی امراض یا اکزیما) کا رقیہ حفصہ کو اسی طرح نہیں

---

[1] القرطبی، النمری، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، ص: ۹۱۵، نمبر شمار: ۳۳۶۵، صححہ و خرج احادیثہ: عادل مرشد، دار الاعلام، عمان، الاردن، ۲۰۰۲ء۔

[2] جمعۃ، احمد خلیل، نساء من عصر النبوۃ، ص: ۱۵۹، دار ابن کثیر، دمشق، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۲۰۰۰ء۔

سکھاؤ گی، جس طرح کتابت کی تعلیم انھیں دی ہے؟"[۳] تعلیم و تدریس اور علاج و معالجہ کی خدمات کی وجہ سے ہی رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں انھیں ایک گھر دے رکھا تھا، جہاں صحابۂ کرام، بالخصوص صحابیاتؓ حاضر ہو کر تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ علی بن نایف الشحود لکھتے ہیں:

"تعلیم اور امراض و زخموں کے علاج کے سلسلہ میں ان کی خدمت نمایاں تھی۔ ان کے اسی سوشل کردار کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ان کے لئے ایک گھر خاص کر رکھا تھا، جس میں یہ اور ان کے بیٹے سلیمان رہائش پذیر تھے۔ ان کا یہ گھر عورتوں کے لئے علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہیں بہت ساری خواتین نے ان سے طب، کتابت، قراءت اور دین کی تعلیم حاصل کی۔ ان تعلیم حاصل کرنے والیوں میں رسول اللہ ﷺ کی بیوی سیدہ حفصہ بھی تھیں"[۴]۔

پیدائش اور نام و نسب: آپ کے نام کے سلسلہ میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ آپ کا نام "الشفاء" ہے اور یہی مشہور ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کا نام "لیلیٰ" ہے، الشفاء "لقب" ہے اور کنیت "ام سلیمان" ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش مذکور نہیں؛ البتہ اتنی بات ضرور لکھی گئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ہی پیدا ہوئی تھیں اور ان کی والدہ کا نام: فاطمہ بنت أبی وہب بن عمرو بن عائذ بن عمران المخزومیۃ تھا[۵]۔

ازواج و اولاد: ان کی شادی پہلے ابوحثمہ بن حذیفہ بن غانم بن عامر بن عبداللہ بن عبید بن عویج بن عدی بن کعب سے ہوئی، جس سے ایک لڑکا "سلیمان" پیدا ہوا۔ اسی مناسبت سے آپ کو "ام سلیمان" کہا جاتا ہے۔ ابوحثمہ نے فتح مکہ کے موقع سے اسلام قبول کیا تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: "ان کو ابن السکن کہتے ہیں، انھیں (نبی کریم ﷺ کی) صحبت حاصل تھی اور یہ فتح مکہ کے

---

[۳] السجستانی، سلیمان بن الأشعث، أبوداود، سنن أبی داود، باب ماجاء فی الرقی، حدیث نمبر: ۳۸۸۷، اعتناء: أبوعبیدہ مشہور بن حسن آل سلمان، مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۴۲۴ھ؛ الجوزیۃ، ابن القیم، محمد بن أبی بکر، أبوعبداللہ، زاد المعاد: ۴/۱۸۴، تحقیق، تخریج، تعلیق: شعیب الأرنؤوط وعبدالقادر الأرنؤوط، ناشر: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ السادسۃ والعشرون ۱۹۹۲ء۔

[۴] الشحود، علی بن نایف، مشاہیر النساء المسلمات، ص: ۱۸۸-۱۸۹۔

[۵] دیکھئے: العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی الحافظ، الإصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۱۳/۵۱۷، نمبر شمار: ۱۱۵۱۱، تحقیق: دکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی، مرکز ہجر للبحوث والدراسات العربیۃ الإسلامیۃ، ۲۰۰۸ء؛ السعید، مسعود، عبداللہ عبدالرزاق، الطب ورائداتہ المسلمات، ص: ۸۰، مکتبۃ المنار، الزرقاء، الاردن، ۱۹۸۵ء۔

موقع سے اسلام لانے والوں میں سے ہیں"[۶]۔

حضرت شفاءؓ کے بطن سے تولد ہونے والے ابو حثمہ کے بیٹے سلیمان کی پیدائش عہد نبوی میں ہوئی تھی، عہد عمری میں وہ جوان تھے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں عورتوں کی امامت پر مامور کر رکھا تھا[۷]۔ ابن الاثیر کے بقول، سلیمان کو شرف صحابیت حاصل نہیں ہو سکی تھی[۸]۔ حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں:

انھوں نے اپنی ماں کے ساتھ بچپن میں ہی ہجرت کی۔ ان کا شمار نیک اور صالح مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بازار کا ذمہ دار مقرر کیا تھا، نیز ان کی اور ابی بن کعب کی امامت پر لوگوں کو متفق کر دیا تھا؛ تاکہ وہ دونوں ماہ رمضان کے دوران نماز پڑھائیں۔ وہ کبار تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں[۹]۔

حضرت شفاء کی دوسری شادی ان کے پہلے شوہر کے بھائی مرزوق بن حذیفہ بن غانم بن عامر بن عبد اللہ بن عبید بن عویج بن عدی بن کعب سے ہوئی تھی۔ ان سے بھی ایک لڑکا تھا۔ ابن سعد لکھتے ہیں: "مرزوق بن حذیفہ کا بھی ایک لڑکا "ابو حکیم" ان سے تولد ہوا، جو ایک شریف شخص تھا"[۱۰]۔ ان کی اولاد میں ایک لڑکی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چنانچہ خود انہی سے روایت ہے:

ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے پاس آئی، ان سے شکایت بھی کی اور کچھ مانگا بھی۔ وہ مجھ سے

---

[۶] العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی الحافظ، الإصابة فی تمییز الصحابة: ۱۲/ ۱۴۷، نمبر شمار: ۹۷۷۶، تحقیق: دکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، مرکز ہجر للبحوث والدراسات العربیة الإسلامیة، ۲۰۰۸ء؛ الجزری، ابن الاثیر، علی بن محمد أبو الحسن، اسد الغابة فی معرفة الصحابة: ۶/ ۶۶، نمبر شمار: ۵۸۰۱، تحقیق و تعلیق: الشیخ علی محمد معوض والشیخ عادل احمد عبد الموجود، نادر: دار الکتب العلمیة، بیروت۔

[۷] الزہری، محمد بن سعد، الطبقات الکبری: ۷/ ۳۰، نمبر شمار: ۱۴۳۶، تحقیق: دکتور علی محمد عمر، ناشر مکتبة الخانجی، قاہرہ، ۲۰۰۱ء۔

[۸] الجزری، ابن أثیر، أسد الغابة فی معرفة الصحابة: ۲/ ۵۴۷، نمبر شمار: ۲۲۲۹، تحقیق و تعلیق: الشیخ علی محمد معوض والشیخ عادل احمد عبد الموجود، دار الکتب العلمیة، بیروت۔

[۹] القرطبی، النمری، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر، الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، ص: ۲۹۴- ۲۹۵، نمبر شمار: ۹۵۵، صححہ و خرج احادیثہ: عادل مرشد، ناشر: دار الاعلام، عمان، الاردن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۲ء۔

[۱۰] الزہری، محمد بن سعد، الطبقات الکبری: ۱۰/ ۲۵۴، نمبر شمار: ۵۰۴۳، تحقیق: دکتور علی محمد عمر، ناشر مکتبة الخانجی، قاہرہ، ۲۰۰۱ء۔

معذرت کرنے لگے اور میں انھیں الٹاسیدھا کہنے لگی۔ وہ کہتی ہیں: پھر نماز کا وقت ہو گیا تو میں اپنی بیٹی کے گھر چلی گئی، جو شرحبیل بن حسنہ کے نکاح میں تھی۔ میں نے اس کے شوہر کو گھر میں پایا تو اسے ملامت کرنے لگی، میں نے کہا: نماز کا وقت ہو گیا ہے اور تم یہیں ہو! اس نے کہا: خالہ! ملامت نہ کریں۔ اصل میں میرے پاس صرف دو کپڑے تھے، ایک کو رسول اللہ ﷺ نے عاریتاً لیا ہے۔ میں نے کہا: میرے ماں باپ قربان! ان کی حالت تو یہ ہے اور میں انھیں برا بھلا کہہ رہی تھی![11]

اسلام و ہجرت: یہ مکہ کی ان خواتین میں سے ہیں جو ہجرت سے پہلے ہی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی تھیں اور جنھوں نے ابتدائی دور میں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں: "شفاء نے ہجرت سے قبل اسلام قبول کیا تھا، پس وہ اولین ہجرت کرنے والوں میں سے ہیں"[12]۔ ابن سعد لکھتے ہیں: "شفاء نے ہجرت سے پہلے ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا اور نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت بھی کی"[13]۔ اس تعلق سے محمود طعمہ حلبی لکھتے ہیں:

شفاء پورے شعور و عقل کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئیں۔ ہجرتِ مدینہ سے قبل انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ ان خواتین میں سے تھیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اللہ تعالیٰ کے قول (اے پیغمبر! جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ اللہ کے ساتھ نہ تو شرک کریں گی، نہ چوری کریں گی، نہ بدکاری کریں گی، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی اور نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے اللہ سے بخشش مانگو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان

---

[11] النیسابوری، الحاکم، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، المستدرک علی الصحیحین: ۴/ ۶۴، نمبر شمار: ۶۸۹۲، دراسہ و تحقیق: مصطفی عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۲۰۰۲ء۔

[12] القرطبی، النمری، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، ص: ۹۱۵، نمبر شمار: ۳۳۶۵، صححہ و خرج احادیثہ: عادل مرشد، دار الاعلام، عمان، الاردن، ۲۰۰۲ء، العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی الحافظ، الإصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۱۳/ ۵۱۷، نمبر شمار: ۱۱۵۱۱، تحقیق: دکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، مرکز ہجر للبحوث والدراسات العربیۃ الإسلامیۃ، ۲۰۰۸ء۔

[13] الزہری، محمد بن سعد، الطبقات الکبری: ۱۰/ ۲۵۴، نمبر شمار: ۵۰۴۳، تحقیق: دکتور علی محمد عمر، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ، ۲۰۰۱ء۔

ہے)[۱۴] میں شمولیت اختیار کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے بغیر مصافحہ کے بیعت لی تھی کہ آپ ﷺ عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتے تھے، جب کوئی خاتون مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتی تو آپ رک جاتے اور اسے بتاتے (کہ عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتے)۔[۱۵]

غزوات میں شرکت: عہد نبوی میں خواتین آپ ﷺ کی اجازت سے میدان جہاد میں جایا کرتی تھیں، جہاں ان کے ذمے مجاہدین کو پانی پلانا، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا اور مریضوں کی دیکھ بھال کرنا جیسے امور ہوا کرتے تھے۔ صلاح عبد الغنی لکھتے ہیں:

یہ بات ثابت شدہ ہے کہ عورتیں نبی کریم ﷺ کی اجازت سے مردوں کی خدمت، زخمیوں کی تیمارداری اور ریلیف کے امور انجام دینے کے لئے لشکر کے ساتھ جاتی تھیں۔ چنانچہ امام محمد عبدہ لکھتے ہیں: عہد نبوی اور عہد خلفاء میں مریضوں کی دیکھ بھال اور زخمیوں کا علاج عورتیں کیا کرتی تھیں، جس کے لئے وہ اللہ کے راستے میں غازیوں کے ساتھ نکلتی تھیں۔ اس سلسلے میں امام بخاری نے ایک باب: باب غزوۃ النساء وقتالھن کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس میں حضرت ربیع بنت معوذ کی روایت نقل کی گئی ہے جس میں وہ فرماتی ہیں: "ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قوم کی خدمت کرنے، ان کو پانی پلانے اور مقتولین وزخمیوں کو مدینہ منتقل کرنے کی غرض سے جہاد میں جایا کرتی تھیں... رسول اللہ ﷺ کے ہر غزوہ میں خواتین شریک رہیں[۱۶]۔

حضرت شفاء رضی اللہ عنہا بھی خواتین کی اسی جماعت سے تعلق رکھتی تھیں، جن کے بارے میں آتا ہے کہ وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ میدان جہاد میں جایا کرتی تھیں۔ محمد سمیر نجیب لبدی لکھتے ہیں: "وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتی تھیں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ صحابہ علم طب کے حصول کے لئے ان کے گھر آیا کرتے تھے، وہ رقیہ نملہ میں شہرت رکھتی تھیں"[۱۷]۔

حضرت شفاء اور علم طب: حضرت شفاءؓ کا شمار عہد نبوی کی ان خواتین میں ہوتا ہے جنھیں علم طب

---

[۱۴] الممتحنۃ ۱۲۔

[۱۵] حلبی، محمد طعمۃ، المائۃ الأوائل من صحابیات رسول اللہ، ص:۳۹۶، دار المعرفۃ بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۲۰۰۶ء۔

[۱۶] صلاح، عبد الغنی، محمد، الحقوق العامۃ للمرأۃ، ص:۱۳۲-۱۳۳، مکتبۃ الدار العربیۃ للکتاب، قاھرہ، ۱۹۹۸ء۔

[۱۷] اللبدی، محمد سمیر نجیب، الدکتور، معانی الأسماء، ص:۱۰۵، دار الفلاح للنشر والتوزیع، الأردن، ۱۹۹۸ء۔

میں مہارت تھی۔ راجی عباس تکریتی لکھتے ہیں: ”علم طب کو بطور پیشہ اختیار کرنے والی خواتین میں شفاء بنت عبداللہ اور رفیدہ ہیں، جو جراحی میں مشہور تھیں اور یہ مسلمان زخمیوں کا علاج کرتی تھیں“[۱۸]۔

ان کی شہرت جلدی امراض کے ماہر کے طور پر تھی۔ ڈاکٹر حنان ولید محمد سامرائی اور زینت ابراہیم خلیل لکھتے ہیں: ”عصر نبوی میں جلدی امراض کے علاج کی یہ مشہور طبیبہ تھیں“[۱۹]۔ ڈاکٹر عبداللہ عبد الرزاق نے انھیں جلدی ناسور کا اسپیشلسٹ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ” شفاء بنت عبداللہ قریشی جلدی ناسور (نملہ) کے علاج کی اسپیشلسٹ تھیں“[۲۰]۔

علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ یہ زمانہ جاہلیت میں رقیہ و منتر کے ذریعہ نملہ[۲۱] کا علاج کرتی تھیں۔ پھر جب اسلام لائیں تو انھوں نے اس سلسلے میں باقاعدہ نبی کریم ﷺ سے اس کی اجازت لی۔ ابن قیم لکھتے ہیں: ”خلال نے روایت کیا ہے کہ: شفاء بنت عبداللہ زمانۂ جاہلیت میں نملہ بیماری کا علاج رقیہ سے کرتی تھیں۔ یہ مکہ میں ہی حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر چکی تھیں۔ اس لئے جب ہجرت کر کے نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں تو ان سے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں جاہلیت میں نملہ کا علاج رقیہ سے کرتی تھی تو میں چاہتی ہوں وہ آپ کے روبرو پیش کروں، پھر میں نے پیش کیا، جو اس طرح تھا: ”بسم الله ضلت حتى تعود من أفواهها، ولاتضر أحداً، اللهم اكشف البأس رب الناس“۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ ان کلمات کو لکڑی پر سات مرتبہ دم کرتی تھیں، پھر ایک صاف ستھری جگہ جا کر شراب کے سر کے میں تر پتھر پر اس کو رگڑتی تھیں اور

---

[۱۸] التکریتی، راجی عباس، الحکیم، الاسناد الطبی فی الجیوش العربیۃ الإسلامیۃ، ص: ۵۳، وزارۃ الثقافۃ والاعلام، الجمہوریۃ العراقیۃ (مکتبۃ المہتدین الإسلامیۃ) ۱۹۸۴ء۔

[۱۹] مجلۃ التطویر العلمی للدراسات والبحوث، المجلد الثالث، العدد: ۱۱ (۲۰۲۲)، السامرائی، حنان ولید محمد، وزینۃ إبراہیم خلیل، المرأۃ وتاریخ تطور مہنۃ الطب من العصر الجاہلی وحتی العصر الحدیث، ص: ۵۰-۲۸۳، جامعۃ سامراء، العراق۔

[۲۰] السعید، عبداللہ عبد الرزاق مسعود، الدکتور، الطب ورائداتہ المسلمات، ص: ۸۰، مکتبۃ المنار، الأردن، ۱۹۸۵ء۔

[۲۱] نملہ بیماری کے تعلق سے ابن قیم لکھتے ہیں: النملۃ: قروح تخرج فی الجنبین، وہو داء معروف، وسمی نملۃ لأن صاحبہ یحس فی مکانہ کأن نملۃ تدب علیہ وتعضہ۔ (زاد المعاد: ۴/ ۱۸۴)۔ شوکت شطی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ اکزیما جیسا مرض تھا (تاریخ العلوم الطبیۃ، ص: ۱۷۴۔ ۱۷۵)

نملہ پر رکھتی تھیں"[۲۲]۔

احمد خلیل جمعہ نے انھیں ماہر نفسیات (Psychiatrist) قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "ہمارا یہ علمی سفر طب کے میدان، خصوصیت کے ساتھ نفسیات میں مہارت رکھنے والی ایک صحابیہ کے (حالات کے) ساتھ طے ہوگا، جو شفاء بنت عبداللہ بن عبد شمس قریشی عدوی سے مشہور ہیں"[۲۳]۔

وفات: یہ جلیل القدر صحابیہ میدان علم و طب میں خدمت انجام دیتے ہوئے حضور ﷺ کی وفات کے نو سال بعد بالآخر ۲۰ھ میں اِس جہانِ فانی کو خیر باد کہہ کر اُس جہانِ ابدی کی طرف کوچ کر گئیں، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ احمد خلیل جمعہ لکھتے ہیں: "شفاء علم و عمل اور زہد و تقوی کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے حضرت عمرؓ کی خلافت ۲۰ھ میں اپنے رب حقیقی کے پاس چلی گئیں، رضی اللہ عنہا"[۲۴]۔

---

[۲۲] الجوزیۃ، ابن القیم، محمد بن أبی بکر، أبوعبداللہ، زاد المعاد: ۴/۱۸۴-۱۸۵، تحقیق، تخریج، تعلیق: شعیب الأرنؤوط وعبدالقادر الأرنؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ السادسۃ والعشرون ۱۹۹۲ء، الشطی، دکتور احمد شوکت، تاریخ العلوم الطبیۃ لطلاب السنۃ التحضیریۃ فی الکلیات الطبیۃ، ص:۱۷۴-۱۷۵، وزارۃ التعلیم العالی بالجمهوریۃ العربیۃ السوریۃ ۲۰۱۵-۲۰۱۶ء۔

[۲۳] جمعۃ، أحمد خلیل، نساء من عصر النبوۃ، ص:۱۵۸-۱۵۹، دارابن کثیر، دمشق، الطبعۃ الثانیۃ ۲۰۰۰ء۔

[۲۴] جمعۃ، أحمد خلیل، نساء من عصر النبوۃ، ص:۱۶۳، دارابن کثیر، دمشق، الطبعۃ الثانیۃ ۲۰۰۰ء، کحالۃ، عمر رضا، الدکتور، أعلام النساء فی عالمی العرب والإسلام: ۲/۳۰۱، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ الخامسۃ ۱۹۸۴ء۔

رسالہ اختیار

یعنی ”اسلامی قانون فوجداری“ اور اس کی مترجمانہ خصوصیات

کلیم صفات اصلاحی، رفیق دارالمصنّفین
kaleemsefatislahi@gmail.com

اسلام ایسا مذہب ہے جس نے شخصی و شاہی فرامین میں جکڑی اور محکوم دنیا کو پہلی بار قانون کی بالادستی کا احساس دلایا اور اسلامی حدود کے نفاذ میں اعلیٰ و ادنیٰ کے امتیاز اور امیر و غریب کے فرق کو ختم کیا۔ اس کے قوانین و حدود میں انسانیت کی فوز و فلاح اور معاشرے کے اخلاقی و تمدنی تحفظ و بقا کی پوری ضمانت دی گئی ہے۔ اس کے قوانین فوجداری کے نفاذ میں عدل و انصاف کو مقدم رکھا گیا ہے۔ عادی مجرمین کو سزا دینے میں نرمی برتنے سے اجتناب کا حکم بھی دیا گیا ہے تاکہ جرم کو پنپنے کا موقع اور اس کو پلنے کے لیے غذا نہ ملے اور ہر شخص سکون و اطمئنان اور امن و امان کی فضا میں سانس لے سکے۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں ایک رسالہ ”اختیار“ بھی ہے۔ اس مقالے میں اسی کتاب کے اردو ترجمہ کا جائزہ مقصود ہے۔

اس کے مصنف مولانا سلامت علی خاں ہیں۔ ان کے متعلق تلاش بسیار کے باوجود کچھ نہ مل سکا۔ مترجم نے جو دو سطری معلومات دیباچے میں رقم کی ہیں اسی پر اس مقالہ میں بھی اکتفا کرنا پڑا کہ ان کا اصل نام ریاست علی خاں ہے جو ”حذاقت خان“ کے نام سے مشہور اور شہر محمد آباد میں عدالت مرافعۂ ثانیہ میں احکام شرعیہ لکھنے پر مامور تھے اور اس کا ماخذ بھی کتاب کے پہلے صفحے کا وہ جملہ ہے جو مصنف نے اپنے تعارف میں لکھ دیا ہے: ”بندۂ عاصی پر معاصی سلامت علی خاں معروف بہ حذاقت علی خاں در بلدۂ محمد آباد بایامے کہ در عدالت مرافعۂ ثانیہ بتحریر احکام شرعی مامور بود“ [1]۔

یہ کتاب اصلاً فارسی و عربی میں تھی۔ اس کے مترجم مولانا عبدالسلام ندوی دارالمصنّفین کے علمی معماروں میں تھے۔ عربی و فارسی دونوں زبانوں پر انہیں یکساں عبور تھا۔ نئے نئے

---

[1] سلامت علی خاں، اختیار، مطبع مولوی کرامت علی موسوی دہلوی، حیدرآباد ۱۲۶۷ھ، ص ۳۔

موضوعات و مضامین کو منتخب کر کے ان پر لکھنا، حسب تقاضہ و ضرورت لکھی جانے والی اہم تصنیفات کو ایسی سلیس و رواں اور شستہ و شگفتہ اردو میں منتقل کرنا، کہ جس سے اصل کا گمان ہو، ان کے قابل ذکر علمی مشاغل میں تھا۔ چنانچہ مولانا کی معجز طرازی قلم سے جو شاہ کار اردو ترجمے منصہ شہود پر آئے ان میں ابن خلدون، انقلاب الأمم، التربیۃ الاستقلالیہ، تاریخ فقہ اسلامی اور مولانا سلامت علی خاں کی فارسی تصنیف "کتاب الاختیار"[۲] کے ترجمہ بعنوان "اسلامی قانون فوج داری" کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں فن ترجمہ نگاری کے اصول و قواعد کا پورا لحاظ اور اس زمانہ کی ریاست حیدرآباد کے مشہور وکیل میر احمد شریف کی فرمائش واعانت سے کیا گیا تھا۔ اس ترجمے کی اشاعت و طباعت سنہ ۱۹۲۹ء میں دارالمصنّفین سے عمل میں آئی لیکن اصلاً یہ کتاب دارالمصنّفین کے منصوبہ کا براہ راست حصہ نہیں تھی اسی لیے اس پر سلسلہ نمبر بھی نہیں درج ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حسب روایت شذرات میں اس کی طباعت کی اطلاع قارئین معارف کو دی اور اس کا مختصر تعارف بھی کرایا[۳]۔

فاضل مترجم نے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۲ھ اصل کتاب کی اس عبارت "و چوں سال یک ہزار و دوصد و دوازدہ از ھجرۃ نبی ﷺ آغاز تالیف این کتاب"[۴] سے تحریر کیا ہے جس کا عیسوی سنہ تقویم کے مطابق ۱۸۷۹-۱۸۸۰ء ہو گا۔ اس کے علاوہ اصل کتاب کے سرورق پر نیچے کے الفاظ "از تصنیفات سلامت علی خاں" سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کی اس کے علاوہ اور بھی تصنیفات تھیں۔

انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہندوستان کی عدالتوں میں اسلامی قانون جاری تھا اور ایک مدت تک مسلمانوں کے معاملات و مقدمات کے فیصلے فقہ حنفی کے مطابق ہوتے تھے جس کے سمجھنے میں انگریز حاکموں کو دقت پیش آتی تھی۔ مولانا کے مطابق اس قسم کی عدالتی ضرورتوں کے حل کے لیے اس زمانے کے علماء نے فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں یہ کتاب بھی تھی۔ اس کے مجموعی مواد و مآخذ کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ اس میں فقہ حنفی کے ایک حصے

[۲] یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ کتاب کا یہ نام مترجم کا تصرف ہے۔ اصل کتاب کا مطبوعہ اور ٹائپ شدہ دونوں ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے، اس میں مصنف نے اس کا نام صرف "اختیار" لکھا ہے۔

[۳] مولانا سید سلیمان ندوی، شذرات سلیمانی حصہ دوم، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۹۷ء، ص ۲۴۲۔

[۴] اختیار (ٹائپ شدہ نسخہ) مطبوعہ کلکتہ، ۱۲۴۴ھ، ص ۳۔

یعنی تعزیرات کے متعلق فقہ کی مستند کتابوں مثلاً قدوری، شرح وقایہ، فتاویٰ قاضی خاں، فتاویٰ حمادیہ، فصول عمادیہ، فتاویٰ سراجیہ، فتاویٰ تابعی، جامع الرموز اور الأشباہ و النظائر وغیرہ سے تمام مسائل مختلف ابواب میں نہایت جامعیت واستقصا کے ساتھ جمع کر دیے ہیں اور ان کتابوں کی اصل عبارت کے بعد اس کا خلاصہ بھی درج کر دیا ہے[۵]۔ ان کتابوں کے علاوہ مآخذ میں مصنف نے منح الغفار، محیط برہانی، خلاصہ وخزانۃ الروایات[۶] وغیرہ کے نام بھی لکھے ہیں۔

جب یہ کتاب اردو میں ترجمہ کی گئی تھی اس وقت انگریزی حکومت کے زیر اثر علاقوں میں اسلامی فوجداری کی تعزیرات و حدود کے متعلق فقہ حنفی پر عمل تقریباً متروک ہو چکا تھا لیکن اس کی افادیت اس زمانے میں بھی بایں طور تھی کہ بعض اسلامی ریاستوں جیسے حیدرآباد وغیرہ میں اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس لیے جو حکام اور عام قانون پیشہ حضرات ان ریاستوں میں کام کرتے تھے ان کے لیے یہ کتاب مفید تھی۔ اس کے علاوہ فاضل مترجم نے اس کی مزید افادیت یہ بھی بتائی ہے کہ جہاں کہیں فقہ حنفی پر عمل نہیں کیا جاتا وہاں اگر کوئی اسلام کے تعزیری احکام کا مقابلہ دوسرے ملکوں، قوموں کے تعزیری احکام اور تعزیرات ہند کی دفعات سے کرنا چاہے تو علمی حیثیت سے یہ کتاب افادیت بخش ہو سکتی ہے۔ اس سے اس کتاب کی ہمہ وقت ضرورت واہمیت ثابت ہوتی ہے۔

فاضل مترجم نے اس کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی کے مطابق اس کتاب کو موجودہ طرز قانون کے مطابق نئی ترتیب دی ہے۔ ایک کالم میں اصل عربی مع حوالہ کتب فقہی ہے۔ دوسرے کالم میں اس کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کو مفید و نفع بخش بنانے کے لیے مزید یہ اضافہ بھی کیا گیا ہے کہ ہر عبارت کے شروع میں ہر دفعہ پر ترتیب وار نمبر اور ہر دفعہ کا خلاصہ، نمبر کے ساتھ بطور عنوان درج کیا ہے[۷] تاکہ اصل مسئلے کی طرف رجوع میں آسانی ہو۔ پوری کتاب میں کل ۱۲۶۵ دفعات درج ہیں۔

آج کے حالات میں جب کہ جرائم عام ہیں، تعزیروں اور سزاؤں کے مقابلے میں مجرمین کے ساتھ عفو ودرگزر، مؤاخذہ، جرموں سے چشم پوشی، کمزور وطاقتور، دولت مند وغریب اور مجرم مرد وعورت میں بھید بھاؤ کا معاملہ روا رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث افراد

---

[۵] اسلامی قانون فوجداری، مترجم مولانا عبدالسلام ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۲۹ء، ص ا۔

[۶] ٹائپ شدہ نسخہ میں "الروایات" کے بجائے "الروایہ" ہے۔ ص ۳۔

[۷] شذرات سلیمانی حصہ دوم، ص ۲۴۲۔

واشخاص پر قابو پانا مشکل ہو گیا ہے۔ ایسے میں یہ کتاب انسانی معاشرے کو گناہوں اور معصیتوں سے پرہیز اور برائیوں کی شناعت اور قباحت کو محسوس کرنے کا پیغام دیتی ہے۔ اس موضوع پر کتابیں اردو میں چونکہ نہ کے برابر ہی شائع ہوئی ہیں اور اس کی پہلی طباعت کو بھی ایک عرصہ گذر چکا ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جانا وقت کی ضرورت اور تقاضہ ہے تاکہ عام قاری اسلامی حدود و قصاص اور تعزیر سے بہ یک نظر واقف ہو سکے۔

مولانا عبد السلام ندوی نے اس پر اپنے دو صفحے پر مشتمل دیباچے میں مصنف، کتاب کے مآخذ اور اس کی ترتیب نو وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات تحریر کی ہیں۔

کتاب کے مباحث کا مختصر تعارف: پوری کتاب میں مباحث و مشتملات کا احاطہ اس جامعیت واستغراق سے کیا گیا ہے کہ موضوع سے متعلق تمام جزئیات آگئی ہیں۔ حدود تعزیرات کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو چھوٹا ہو۔ قارئین کی آسانی کے لیے پورے مواد کو بنیادی طور پر ایک مقدمہ اور دو کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر ان دو کتابوں کو مختلف ابواب وفصول میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقدمے میں حدود و قصاص اور ان کے بعض متعلقہ مسائل کا بیان ہے۔ پہلے حد کی اصطلاحی تعریف کی گئی ہے کہ شریعت میں حد اس مقررہ سزا کو کہتے ہیں جو خدا کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصاص کو حد نہیں کہا جاتا کیونکہ وہ بندے کا حق ہے اور تعزیر کو بھی حد نہیں کہتے کیونکہ وہ مقررہ سزا نہیں ہے۔ اس کے بعد حدود کی قسموں میں زنا، شراب نوشی، تہمت زنا، چوری اور رہزنی کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ صحیح العقل، سلیم البدن، ہوشیار اور طاقتور پر حد جاری کی جاتی ہے۔ شرائط، اس کے فوائد، اختیار، جاری کرنے میں احتیاط، حد سے کب درگذر کی جا سکتی ہے اور حد کب واجب ہو جاتی ہے وغیرہ کے باب میں تفصیل ہے۔ حدو تعزیر اور حد و قصاص میں جو باریک فرق پایا جاتا ہے اس کے اسباب کیا ہیں؟ عدالت، شہادت، شرائط شہادت، غیر مقبول شہادتیں، پنچ کے فیصلہ کی شرعی حیثیت وغیرہ کی وضاحت بڑے سادہ و دلنشین انداز میں کی گئی ہے۔ یہ پوری معلومات شروع کے ۲۸ صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد پہلی کتاب حدود کے بیان میں ہے جو چار ابواب اور ایک فصل پر مشتمل ہے۔ پہلا باب حد سرقہ کے بارے میں ہے جس میں چار فصلیں ہیں۔ ان فصلوں میں سرقہ کے معنی، شرائط، کن چیزوں کی چوری میں ہاتھ کاٹنا ضروری اور کن میں ضروری نہیں، حد سرقہ اور مال مسروقہ اور ڈاکہ وغیرہ کے احکام کا بیان ہے۔ دوسرا باب زنا کی حد سے متعلق ہے اور یہ بھی چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ ان فصول میں زنا کے معنی، اس کے اقرار کی کیفیت، حد زنا کے نفاذ کی

کیفیت، موجب حد و غیر موجب حد مباشرت اور شہادت زنا، شراب خوری، حد قذف اور تعزیرات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ دوسری کتاب جرائم کے بیان پر مشتمل ہے اور اس کے پندرہ ابواب میں جرائم کی تعریف، وجوب وعدم وجوب قصاص، قصاص لینے، قتل کی شہادت دینے، قاتل کے اقرار اور مدعی کی تصدیق و تکذیب، معافی اور ان کی شہادت، اعضا کے قصاص، دیتوں اور زخموں کے متعلق بیان ہے۔ مختصر یہ کہ اس کتاب میں حدود و تعزیرات و قصاص اور جرائم کی تفصیلات اور بہت سے پوشیدہ حقائق کی جس خوبی سے پردہ کشائی کی گئی ہے اس کا صحیح اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اب اس کی مترجمانہ خصوصیات ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا عبد السلام ندوی فن ترجمہ نگاری سے بخوبی آشنا تھے۔ وہ اس کام کو اصل تصنیف سے کم قیمت کا نہیں سمجھتے تھے۔ یہ تاریخی حقیقت بھی ان کے پیش نظر تھی کہ مسلمانوں میں علم و فن کی نشو و نما اور ابتدا کتابوں کے ترجمے سے ہوئی۔ انھوں نے ترجمہ نگاری اور مترجمہ کتابوں کے متعلق ان خیالات کا اظہار انجمن ادبیہ کانپور کے خطبۂ صدارت کے دوران کیا تھا جو پہلے معارف جنوری ۱۹۴۲ء، اس کے بعد ''مقالات عبد السلام'' میں شائع کیا گیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے وہ یہاں پیش ہیں :

> میرے خیال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ جو عربی اور فارسی نہیں جانتا، اگر انگریزی زبان کی بہترین کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کرے تو ہمارے ادبی ذخیرے میں بڑا قیمتی اضافہ ہوسکتا ہے۔ غلطی سے ترجمہ کے کام کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور اس کو ایک حقیر علمی یا ادبی خدمت سمجھا جاتا ہے حالانکہ علمی و ادبی حیثیت سے دو ہی کام سب سے زیادہ مشکل اور سب سے زیادہ اہم ہیں ایک تو بچوں کو سبق پڑھانا اور دوسرے ترجمہ کرنا۔ اس لیے جو لوگ ترجمے کو اوریجنل تصنیفات سے کم رتبہ سمجھتے ہیں وہ دماغی عجب وخود بینی میں مبتلا ہیں۔ مسلمانوں میں علم و فن کی ابتدا اور اشاعت یونانی کتابوں کے ترجموں ہی سے ہوئی[۸]۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا عبد السلام ندوی کو عربی و فارسی زبان و بیان پر بڑی دسترس تھی۔ وسعت مطالعہ نے ان کے ذہن و دماغ کو مزید اخاذ بنا دیا تھا۔ ترجمے میں عبارتوں کی تہ اور مصنف کے مقصد تحقیق تک بہ آسانی پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح ان کے ترجمے کی سلاست و روانی اور برجستگی کو دیکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کے ترجمے میں آئیڈیل اور نمونہ کے ترجموں کے

---

[۸] معارف جنوری ۱۹۴۲ء، ص ۴۲ – و مقالات عبد السلام، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۸۔

تقریباً تمام خصائص واوصاف موجود تھے۔ بعض اصحاب، ترجمہ کا کمال یہ سمجھتے ہیں کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہو بلکہ ایک لفظ کی جگہ ایک ہی لفظ ہو جیسا کہ قرآن مجید کے بعض ترجمے اس کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ جملوں کی نحوی ترکیب کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جائے اور اس میں اردو کی قواعدی بے ضابطگی بھی گوارا کی جا سکتی ہے۔ ترجمہ نگاری کا یہ آئیڈیل بہت دنوں تک متداول و مقبول نہیں رہا۔ مولانا کے یہاں اس آئیڈیل ترجمہ کے نمونے نہیں ملتے ہیں۔ بعض دوسرے مترجمین کسی بھی حال میں عبارت میں ادب کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر ان کو اصطلاحی علوم پر کتابوں کا ترجمہ کرنا ہو تو دامن ادب ہاتھ سے چھوڑنا ہی پڑے گا۔ ورنہ پاؤں زیادہ پھیلانے کے نتیجہ میں چادر کے پھٹ جانے کا امکان واندیشہ بڑھ سکتا ہے۔ یعنی ایسے ترجمے بے مزہ ہو سکتے ہیں۔ اس کا مناسب اور موزوں طریقہ یہ ہے کہ جس کتاب یا فقرے کا ترجمہ کرنا ہو اس کا مفہوم پہلے صحیح طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور پھر اس مفہوم کو اپنی زبان میں اس طرح پرو یا جائے کہ عبارت شروع سے ہی اپنی زبان میں لکھی ہوئی محسوس ہو اور جو ادبی حسن اصل میں موجود ہو وہی ترجمہ میں بھی نظر آئے۔ حالانکہ یہ مرحلہ بہت دشوار ہے لیکن ماہر مترجم اگر اس چیز کو آغاز ہی سے پیش نظر رکھے تو بہت حد تک اس مشکل پر قابو پا سکتا ہے۔ مولانا عبدالسلام کی مہارتِ ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو اس پر پورا قابو تھا، جیسا کہ آئندہ سطور سے یہ واضح ہو جائے گا۔

اچھے برے یا موزوں و ناموزوں ترجموں کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ترجمہ پڑھتے جایئے اور اگر عبارت میں خوبی و قوتِ بیان موجود اور اس کا مفہوم بہ آسانی سمجھ میں آرہا ہے تو ایسا ترجمہ اچھا کہا جائے گا اور اگر ترجمہ میں غیر مانوس الفاظ، بے ربط فقرے اور حل طلب ترکیبیں ہیں تو ترجمہ خواہ اصل مفہوم کے کتنا ہی قریب ہو، ناہموار اور خراب کہا جائے گا۔ مولانا کے ترجمے میں مذکورہ بالا ساری خوبیاں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل عربی و فارسی عبارت کا ترجمہ دیکھیں کہ مولانا نے کتنی خوبصورتی سے اس کا ترجمہ کیا ہے:

الحد فی اللغة هو المنع منه الحداد للبوّاب وفی الشریعة العقوبة المقدرة حقا لله تعالیٰ حتی لایسمّیٰ القصاص حدا لما أنه حق العبد ولا التعزیر لعدم التقدیر۔

اس عربی عبارت کا فارسی ترجمہ مصنف مولانا سلامت علی خاں نے یہ کیا ہے:

حد در لغت بمعنی منع است ودر شریعت عقوبہ معینہ کہ حق خدائے تعالیٰ باشد لہذا قصاص حد

نیست زیرا کہ حق عبد است و نیز تعزیر را حد نمی گویند زیرا کہ عقوبۃ مقدرہ نیست[۹]۔

مولانا نے فارسی و عربی دونوں عبارتوں کو پیش نظر رکھ کر اس کا اردو ترجمہ اس طرح کیا ہے:

لغت میں حد کے معنیٰ منع کے ہیں، اسی لیے دربان کو حداد کہتے ہیں اور شریعت میں حد اس سزا کو کہتے ہیں جو خداوند تعالیٰ کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصاص کو حد نہیں کہا جاتا کیونکہ وہ بندے کا حق ہے اور تعزیر کو بھی حد نہیں کہتے کیونکہ وہ مقررہ سزا نہیں ہے[۱۰]۔

اس ترجمے کی اگر عربی و فارسی عبارت سامنے نہ لائی جائے تو عبارت کی سلاست، جملوں کے باہمی ربط اور مانوس لفظوں کے استعمال کی وجہ سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ اسی طرح المحیط کی بہ ظاہر اس مشکل عربی عبارت کو مولانا کے قلم نے ایک عام عربی داں کے لیے کس قدر آسان کر دیا ہے:

ولو قلع رجل ثنية رجل وثنية القالع مقلوعة فنبتت ثنيته بعد القلع فلا قصاص فيه وللمقلوعة ثنيتة ارشها۔

اس کا فارسی ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

اگر کسی بر کند دندان شخصی را و متعدی ہماں دنداں نداشت و بعد ازاں او را ہماں دنداں پیدا شد بروی قصاص نیست و برای مدعی ارش است[۱۱]۔

اردو ترجمہ دیکھیں:

اگر کسی نے کسی کا دانت اکھیڑ لیا اور مجرم کے منہ میں وہ دانت نہیں تھا۔ پھر وہ دانت نکل آیا تو اس پر قصاص نہیں، البتہ مدعی کو دیت ملے گی[۱۲]۔

مترجم کا فریضہ ہے کہ اصل کا صحیح مطلب سمجھ کر اس کو اپنی زبان میں صفائی سے بیان کرے۔ جہاں تک ممکن ہو مطلب سے نہ ہٹے اور ساتھ ہی اپنی زبان کی خوبی سے بھی بے پروانہ ہو۔ مولانا اس فرض سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ وہ اصل کے مطابق مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ مطلب سے ہٹتے نہیں اور نہ ہی اپنی زبان کی خوبی سے غافل ہوتے ہیں۔ حالانکہ زیر نظر مترجمہ کتاب میں اس

---

(۹) اختیار، ص ۴۔

(۱۰) اسلامی قانون فوجداری، ص ۱۔

(۱۱) اختیار، ص ۱۹۰۔

(۱۲) اسلامی قانون فوجداری، ص ۲۹۴۔

کی اس لیے بھی بہت گنجائش نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی تاریخ و فلسفہ یا ادب کی کتاب نہیں ہے۔ اس میں صرف فقہی کتابوں سے حدود و قصاص، تعزیرات و جرائم کے متعلق شرعی احکام و دفعات اور فقہا کے اقوال کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اس میں ادبی محاسن کے التزام اور ادیبانہ پیرایۂ بیان اختیار کرنے کی چنداں ضرورت یا تقاضہ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے انہوں نے ترجمے پر ادیبانہ رنگ چڑھنے نہیں دیا ہے۔ مولانا یہ سمجھتے تھے کہ اردو میں اسم و فعل یا مبتدا خبر جس قدر قریب ہو گا اسی قدر زبان فصیح اور ضمائر جس قدر کم آئیں گی اسی قدر مطلب جلد سمجھ میں آئے گا۔ مولانا چونکہ زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ فقروں کو اس کے اجزا میں تحلیل کرنے کی ان کے اندر اچھی صلاحیت تھی۔ اس لیے زبان میں بے جا کمی بیشی اور غلط فہمی کے ارتکاب کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ مذکورہ بالا خوبیاں درج ذیل عربی عبارتوں کے ترجمہ میں دیکھی جاسکتی ہیں جس میں شرابیوں اور چوروں کی صحبت پر تعزیر کا حکم ہے۔ مولانا نے کس طرح فقروں کو اس کے اجزا میں تحلیل کرکے جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:

الأصل أن الإنسان يعزر لأجل التهمة منها إذا رأى الإمام رجلا جالسا مع الفساق فى مجلس الشراب عزّره وإن كان هو لا يشرب ومنها إذا رأىٰ الإمام رجلا يمشى مع السرّاق عزّره۔

فارسی اور اردو ترجمہ دیکھیں:

کسی کہ در مجلس فسق و فجور یا در مجلس شراب بنشیند بروی تعزیر است و کسی کہ ہمراہ دزداں باشد نیز بروی تعزیر است[۱۳]۔

اگر کوئی شخص فسق و فجور کی مجلس یا شراب کی مجلس میں بیٹھے گا تو اس پر تعزیر واجب ہو گی اور اگر کوئی شخص چوروں کے ہمراہ رہے گا تو اس کو بھی تعزیر دی جاسکتی ہے[۱۴]۔

یکے بعد دیگرے آنے والے جملوں کے صحیح ترجمے کے بعد اس بات کا دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جو ربط دونوں فقروں میں ہے وہ اصل متن میں بھی ہے یا نہیں۔ اگر ربط نہیں ہے تو اس کو سخت عیب اور مترجم کی عدم لیاقت پر محمول کیا جاتا ہے۔ مولانا کے ترجمے اس عیب سے بھی پاک ہیں۔ مولانا نے لفظوں کے الٹ پھیر سے اس عیب کو رفع کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی و فارسی اقتباسات کے مصنّفین کو جس طرح اپنی زبان پر قدرت

---

[۱۳] اختیار، ص ۱۱۸۔

[۱۴] اسلامی قانون فوجداری، ص ۱۸۴۔

حاصل ہے وہی قدرت تقریباً مولانا کو بھی عربی و فارسی اور اپنی زبان اردو پر حاصل ہے۔ ترجمے کے دوران مولانا اسی لیے مصنف کے ہم خیال ہو جاتے ہیں اور عبارتوں کا صحیح مفہوم بیان کرنے سے قاصر نہیں رہتے جیسا کہ اس خصوصیت سے عاری مترجمین صحیح ترجمانی سے قاصر نظر آتے ہیں۔

کوئی مترجم خواہ کتنا ہی بڑا ماہر فن ہو اگر اس کی طبیعت خاص موضوع پر کسی خاص کتاب یا مخصوص مقالے کے ترجمے سے پہلے اس کے مالہ و ماعلیہ سے آشنا اور اس کے ضروری پہلوؤں سے مانوس نہیں ہے اور اس نے اس مضمون کی دوسری کتابوں یا مقالات پر بالاستیعاب نظر نہیں ڈالی ہے تو ترجمے میں بہت سی دقتوں اور قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ منتخب موضوع پر کتابوں اور مقالات کے مطالعے سے ترجمہ آسان ہو جائے گا اور اس میں صحت، بے تکلفی اور برجستگی بھی پیدا ہو جائے گی۔ زیر نظر کتاب کا ترجمہ یہ بتاتا ہے کہ مولانا نے فقہ واصول فقہ اور دینی و فقہی مصطلحات کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور ان کو ان موضوعات سے خاصی دلچسپی بھی تھی۔ اسی لیے ترجمہ میں بے تکلفی اور برجستگی موجود ہے۔ کہیں عبارت میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی، ژولیدگی، اشتباہ، اہمال یا الجھاؤ نظر نہیں آتا۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ زبانوں کے مخصوص مزاج و ہیئت، لفظوں کے معانی و مفاہیم میں کشادگی و تنگی اور جملوں کی ساخت کے سبب ترجمے کے وقت اصل متن میں مترجم کو بعض اوقات حذف و اضافہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے مراحل میں کامیاب مترجم بڑی احتیاط سے اپنی بصیرت و نکتہ رسی کو کام میں لا کر بے اعتدالی اور عدم توازن سے خود کو بچا لیتا ہے اور یہ حذف و اضافہ تلخیص و تفسیر یا تشریح نہیں بن پاتا جو بنیادی طور پر مترجم کا کام نہیں ہے۔ مولانا کا یہ شعور وادراک ان کی تمام مترجمہ کتابوں میں نظر آتا ہے۔ اس ترجمے میں بھی بعض مقامات پر اس وصف کا اندازہ ہوا۔ اس ضمن میں قتل عمد کے حکم پر مشتمل ہدایہ کے درج ذیل طویل عربی وفارسی اقتباس کو پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے مذکورہ دعویٰ کی تصدیق وتائید ہوتی ہے۔ اس میں بعض لفظوں کو ترجمہ میں حذف کر دیا گیا ہے۔

وموجب ذلک المأثم لقوله تعالیٰ ﴿وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ﴾ الآیہ. وقد نطق به غیر واحد من السنة وعلیه انعقد إجماع الأمة؛ والقود لقوله تعالیٰ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى﴾ إلا أنه یقید بوصف العمدیة لقوله علیه السلام العمد قود أی موجبه (الهدایة).

وگناہ قاتل در قتل عمد ثابت است بنص کلام اللہ و اجماع و لازم شدن قصاص ثابت است بنص کلام اللہ و بحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [۱۵]۔

اور قتل عمد میں قاتل کا گناہ نص قرآنی اور اجماع سے ثابت ہے اور وجوب قصاص نص قرآنی اور حدیث سے ثابت ہے [۱۶]۔

ناظرین دیکھ سکتے ہیں کہ عربی عبارت کے فارسی ترجمے میں آیت اور بعض الفاظ حدیث کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ مولانا نے بھی اس سے صرف نظر کرتے ہوئے فارسی عبارت کا ہی ترجمہ کر دیا ہے۔ اس حذف اور ترک ترجمہ سے عبارت کے مفہوم و معنی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس پر اصل متن سے زیادہ قدرت ہونی چاہیے۔ کیونکہ مترجم، مصنف کے خیالات کو ترجمے کی زبان اور اس کے اسلوب میں اسی وقت ڈھال سکتا ہے جب اس کو ترجمہ کی زبان پر عبور اور تعبیرات، دلالت الفاظ اور مترادفات کے مابین نازک امتیازات کا صحیح ادراک ہو اور کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ندوی کو اردو پر عربی و فارسی سے زیادہ دسترس حاصل نہیں تھی۔ اس کی شہادت زیر نظر کتاب کے ترجمے کی ہر سطر میں موجود ہے۔

زیر نظر کتاب کا مواد عربی و فارسی دونوں زبانوں میں ہے۔ مصنف نے عربی اقتباسات کو فارسی میں منتقل کیا۔ پھر مترجم نے فارسی اور عربی دونوں اقتباسات کو پیش نظر رکھ کر اس کو اردو میں منتقل کیا۔ طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ ایک کالم میں اصل ماخذ عربی کے اقتباسات اور اسی کے سامنے دوسرے کالم میں مصنف کے فارسی ترجمے کو اردو قالب دے دیا اور فارسی متون حذف کر دیے۔ ہم نے فارسی اقتباسات اصل کتاب سے نقل کیے ہیں تاکہ قارئین کو اصل عربی متن کے ساتھ ساتھ مصنف کتاب کے فارسی اور مولانا کے اردو ترجمہ تینوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا موقع ملے۔

زیر نظر کتاب بلاشبہ ایک دستاویزی کتاب ہے۔ اس کتاب میں اسلامی قوانین فوجداری کی تمام دفعات کا احاطہ فقہ کی مستند کتابوں سے کیا گیا ہے۔ تقریباً ۹۳ برس قبل کیے گئے اس کے اردو ترجمے کو آج بھی سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ مثالی ترجمے کے تمام قواعد وضوابط اور خصوصیات سے یہ ترجمہ متصف ہے۔ اس موضوع پر اب اردو زبان میں متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں

---

[۱۵] اختیار، ۱۲۳۔

[۱۶] اسلامی قانون فوجداری، ص ۱۸۰-۱۸۱۔ (اگر اصل کتاب میں ھدایہ کی عربی عبارت بھی نقل کی گئی ہے تو فارسی ترجمے میں اس کے کسی اہم حصے کو حذف کرنا مناسب نہیں تھا— مدیر)۔

لیکن اس کی افادیت و اہمیت اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ اسلامی قوانین فوجداری کی تقریباً تمام دفعات کو نہایت آسان زبان میں سمجھا دیا گیا ہے۔ قانون پیشہ افراد کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کو بھی اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ البتہ بعض تعزیرات کے مدارج کے سلسلہ میں ایسی باتیں موجود ہیں کہ جن سے ایک عام شخص کے دل میں کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ نعوذ باللہ اسلام اشراف وارذال میں تفریق کو جائز قرار دیتا ہے اور قاضی کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ ایک ہی جرم کے مرتکب اعلیٰ و متوسط کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ مدارج تعزیر کے ضمن میں لکھا ہوا ہے کہ جاننا چاہیے کہ تعزیر مدّعاعلیہ کے مرتبے کے موافق ہوتی ہے یعنی اشراف الاشراف مثلاً علماو سادات کی تعزیر یہ ہے کہ قاضی ان کے پاس کہلا بھیجے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس قسم کے کام کرتے ہیں۔ اور شرفا یعنی امرا اور زمینداروں کی تعزیر یہ ہے کہ قاضی ان کو طلب کرے اور ان کے ساتھ مخاصمت کرے اور متوسط درجے کے آدمی یعنی اہل بازار کی تعزیر یہ ہے کہ قاضی ان کو طلب کرے اور قید کرے اور نیچے درجے کے آدمی کی تعزیر یہ ہے کہ قاضی اس کو طلب کرے، قید کرے اور کوڑے کی سزا دے۔ جو شخص لوگوں کو برا بھلا کہتا ہے اگر وہ معزز ہو تو امام اس کو نصیحت سے باز رکھے گا۔ اگر متوسط درجے کا آدمی ہو تو قید کرے گا اور اگر نیچے درجے کا آدمی ہو تو اس کو کوڑے اور قید کی سزا دے گا[۱۷]۔ ایسے مقامات پر ضرورت کے باوجود وضاحت اس لیے نہیں کی گئی ہے کہ یہ مترجم کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔[۱۸]

---

[۱۷] اسلامی قانون فوجداری، ص۱۵۷-۱۵۸۔

[۱۸] یہ توجیہ مناسب نہیں ہے۔ مترجم اور مضمون نگار کو اس رائے پر تنقید کرنی چاہئے تھی جو بگڑے ہوئے اسلامی معاشرے کی عکاس ہے۔ یہ واضح ہے کہ یہ رائے اس اسلام سے میل نہیں کھاتی ہے جس کے نبیؐ نے کہا تھا کہ اگر ان کی بیٹی فاطمہ چوری کرتی تو وہ اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتے اور انہوں نے تنبیہ کی تھی کہ تم سے پہلے قومیں اس لئے تباہ ہوئی تھیں کہ انھوں نے اشراف اور عام لوگوں سے معاملے میں تمیز کی (إنما هلك الذين من قبلكم أنهم كانوا إذا سرق فيهمُ الشريفُ تركوه، وإذا سرق فيهمُ الضعيفُ أقاموا عليه الحدَّ. وأيمُ اللهِ لو أن فاطمةَ بنتَ محمدٍ سرقتْ لقطعتُ يدَها(بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر ۳۴۷۵)۔ یہ روایت الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری کے اندر کئی اور جگہوں پر آئی ہے مثلاً کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ (۳۷۳۲)، کتاب المغازی (۴۳۰۴)، کتاب الحدود (۶۷۸۸)۔ نیز حدیث کی دیگر اہم کتب مثلاً صحیح مسلم میں کتاب الحدود (۱۶۸۸)، سنن ابوداود میں کتاب الحدود (۴۳۷۳) اور سنن نسائی میں کتاب قطع السارق (۴۸۹۵، ۴۸۹۷-۴۹۰۳) میں بھی بالفاظ دیگر مروی ہے (مدیر)۔

روضۃ الاولیاء کی تاریخی و ادبی اہمیت

ڈاکٹر نصرت انصاری
علی گڑھ
ansarimohdasif877@gmail.com

آزاد حسین بلگرامی اپنی گراں قدر تصانیف کے باعث ہندوستان کی اہم اور مایہ ناز شخصیات میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے گراں بہاں سرمایہ میں سرو آزاد، ید بیضا، فرہنگ عامرہ کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں متعدد تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں بلگرامی ایک اہم تصنیف ''روضۃ الاولیاء'' ہے جو ۱۳۱۰ھ میں مطبع اعجاز صفدری اور ۱۹۹۶ء میں رامپور سے شائع ہوئی۔ بلگرامی کی اس تصنیف کو اگر صوفیہ کا تذکرہ یا مختصر سار سالہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

مصنف نے روضۃ الاولیاء اس وقت تصنیف کی، جب وہ اپنی سیاحت کے دوران علم و ادب کے اہم مرکز اور چشتیہ سلسلہ کے مشاہیر و علماء کے دیار دکن گئے اور خلد آباد عرف روضہ شریف کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ وہ اس سر سبز شاداب خطہ کی خوشگوار اور معطر فضاء سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی باقی ماندہ زندگی اسی جگہ بسر کی۔[۱] اورنگ آباد کے قیام کے دوران ہی انہوں نے روضۂ مقدس کی زیارت کے بعد خلد آباد (مہاراشٹر) کے دس جلیل القدر صوفیہ اور روحانی پیشواؤں کے حالات اور ملفوظات جو کتابوں میں متفرق تھے جمع و ترتیب کرنے کے بعد کتابی شکل دے کر ''روضۃ الاولیاء'' کے نام سے متعارف کیا۔ آزاد بلگرامی روضۃ الاولیاء میں درج بزرگان دین کے حالات و اقوال کے بیان کرنے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

> حقوقیکہ از روحانیت این محتشمان درگاہ کبریا بر ذمہ خود محقق گشتہ بقدر امکان اور اسازیم واللہ والمتکان وعلیہ التکلان۔[۲]

روضۃ الاولیاء کا آغاز عربی عبارت سے ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء اور نعت نبی پاک ﷺ

---

[۱] روضۃ الاولیاء، ص:۲

[۲] ماخذ سابق، ص:۴

کی ہے۔ اس کے بعد نبی پاک ﷺ آل رسول، خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام پر رحمتوں کے نزول کی دعا کے بعد دولت آباد کے اس کوہ شامخ اور حصار کا ذکر ہے جہاں شیخ برہان الدین غریب نے امیر حسین دہلوی اور دیگر بزرگان دین کے ساتھ محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں دارالخلافہ (۷۲۷ھ) کی منتقلی کے موقع پر دہلی سے ہجرت کر کے نئے دار السلطنت دولت آباد آکر سکونت اختیار کی جہاں ان کا مزار "فائض الانوار" کے نام سے آج بھی موجود ہے یہ آبادی "روضہ" کے نام سے مشہور ہے اور لوگوں کے مختلف طبقات اس باسعادت جگہ پر ساکن ہیں۔ جب مغل بادشاہ اورنگ زیب نے اس جگہ کو فتح کیا اور شاہ عالم بہادر شاہ وہاں کا حاکم مقرر ہوا، تو اس نے اس جنت نظیر خانقاہ کو مزید استحکام بخشا اور اس کی رونق وخوبصورتی میں اضافہ کیا۔ روضۃ الاولیاء میں ایلورہ کے بت خانہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جسے ہندوستان کے قدیم ترین آتش پرستوں کے حکم سے ماہر سنگ تراشوں نے اپنے ہنر سے جلا بخشی۔

بلگرامی نے اپنی تصنیف میں دولت آباد کی جغرافیہ کا بیان بھی وضاحت کے ساتھ کیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ دولت آباد ایک خوبصورت دلکش اور پر ُفضا مقام تھا وہ اس جگہ کے سبزہ زار، پہاڑوں کی بلندی سے گرتے آبشار، سبک روی سے بہتی نہریں اور قدرتی مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موسم برسات میں دولت آباد کے صحرا اور پہاڑ بارش کے پانی سے سیراب ہو کر ایسے دلکش نظارے پیش کرتے ہیں جو انسان کے دل ودماغ کو معطر کر دیتے ہیں اس جگہ کی دلکشی کا اعتراف محمد جان قدسی نے اپنے اشعار میں کیا ہے جو بلگرامی نے اپنی تصنیف میں نقل کئے ہیں۔[۳]

روضۃ الاولیاء میں دولت آباد کی ایک وسیع نہر "نہر قتلو" کا ذکر بھی ملتا ہے جسے سلطان محمد بن تغلق کے اتالیق نے اس وقت کھدوائی جب اس نے سلطان کے حکم سے چند دن کے لئے دولت آباد کی حکومت کا انتظام وانصرام سنبھالا تھا۔ مصنف نے قتلغ خاں کی عدل گستری کی تعریف مندرجہ ذیل عبارت میں کی ہے:

درعدالت وحسن سلوک عدیل ونظیر نداشت۔[۴]

مصنف نے روضۃ الاولیاء میں چشتیہ سلسلہ کے جن مشائخ کا ذکر کیا ہے ان میں بیشتر صوفیہ

---

[۳] ماخذ سابق، ص:۳

[۴] ماخذ سابق، ص:۵۱

عہد تغلق میں بہ حکم سلطان دہلی سے ہجرت کر کے دولت آباد آکر آباد ہوئے تھے، جہاں انہوں نے درس و تدریس میں مشغول ہو کر نہ صرف لوگوں کا دل جیتا، بلکہ ان کے دل و دماغ کو اپنے پُر اثر وعظ کے ذریعہ ذاتِ باری تعالیٰ کی محبت سے معمور کیا۔

مصنف نے اپنی تصنیف میں شیخ برہان الدین غریب اور ان کے مرید، شیخ منتجب الدین زرزری زر بخش، سید محمد، حضرت گیسو دراز، مولانا فرید الدین، خواجہ حسن دہلوی، شیخ زین الدین، شیخ گنج رواں اور شاہ خاکسار کے حالات و واقعات مفصل بیان کئے ہیں لیکن زیر نظر مقالہ میں راقمہ نے حسب ذیل صوفیہ کے حالات و واقعات پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔

۱- شیخ برہان الدین غریب

۲- شیخ منتجب الدین زرزری زر بخش

۳- سید محمود گیسو دراز بندہ نواز

بلگرامی نے جس اہم شخصیت کا ذکر سب سے پہلے کیا ہے وہ شیخ برہان الدین غریب ہیں۔ روضۃ الاولیاء میں درج ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر ان کے معتقد ہونے کے بعد آپ اپنے روحانی پیشوا کی تقلید میں سماع، گلو کے ساتھ وجد و رقص بھی کرتے تھے۔ آپ کے ملفوظات شیخ حسین عماد کاشانی نے نفائس الانفاس کے نام سے مرتب کئے۔ اس کے علاوہ حماد بن عماد نے بھی شیخ کے ملفوظات احسن الاقوال اور ان کے دوسرے بھائی مجد الدین بن عماد نے دو رسالے، ایک غریب الکرامات اور دوسرا بقیۃ الغرایب کے نام سے لکھے جو شیخ کی کرامات پر مشتمل ہیں۔ یہ سہ برادر اہل بیعت کی جماعت سے تھے اور شیخ کے مرید معتقد تھے۔ انہوں نے تمام عمر شیخ کے ملفوظات جمع و مرتب کرنے میں صرف کی۔

روضۃ الاولیاء شیخ برہان الدین غریب کے بھائی منتجب الدین زرزری زر بخش کے سلسلہ میں بھی اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ بلگرامی معارج الولایت کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ”منتجب شیخ برہان الدین کے بھائی اور فرید گنج شکر کے مرید تھے۔“ علاوہ ازیں صاحب معارف الولایت نے اپنے اشعار میں آپ کی مدح بھی کی ہے جس سے معارج الولایت کے بیان کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

روضۃ الاولیاء میں نقل ہے کہ جب شیخ مجاہدہ و ریاضت میں درجۂ کمال کو پہنچے تو صبح و شام غیب سے دو سونے کی خلعت آتیں جنہیں فروخت کر کے آپ اس کی قیمت لوگوں میں تقسیم کر دیتے اور اپنے لئے کوئی چیز باقی نہیں رکھتے، جس کے سبب آپ زرزری زر بخش کے نام سے مشہور ہوئے۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ ”نماز تہجد کے وقت سونے کی ایک ڈبیہ عالم غیب سے آتی تھی اور شاہ اس کو صبح کے وقت فروخت کر کے درویشوں پر خرچ کرتے تھے اس لئے زر بخش مشہور ہوئے۔ موسیٰ خاں جرأت کہتا ہے کہ:

آن جوان مردی کہ در راہِ خدا
زر بہ محتاجاں رساند زرزری است

روضۃ الاولیاء واحد تصنیف ہے جو شیخ صاحب کے بھائی شیخ منتجب الدین کے حالات وواقعات پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے۔

بلگرامی نے شیخ برہان الدین کے بعد حضرت گیسو دراز بندہ نواز کے مفصل حالات بیان کئے ہیں۔ روضۃ الاولیاء میں نقل ہے کہ آپ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر ریاضت ومجاہدہ میں مشغول ہوئے اور علوم باطن میں درجۂ کمال حاصل کر کے ہزار ہا افراد کے دلوں کا کعبۂ عرفان بنے۔ بلگرامی حضرت گیسو دراز کے خطاب کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ نصیر الدین دہلوی پالکی مین سوار ہو کر کہیں جارہے تھے کہ آپ کے لمبے بال شیخ صاحب کی پالکی کی درازوں میں پھنس گئے لیکن آپ نے شیخ صاحب کے خیال سے آزاد نہیں کیا، جب حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے اور سید صاحب کو گیسو دراز کے خطاب سے نوازا، تیمور کے حملہ کے وقت آپ دہلی سے ہجرت کر کے دکن گئے اور گلبرگہ میں سکونت اختیار کی، تو ہزاروں لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے جن کو آپ نے اپنی تعلیم کے ذریعہ راہ خدا آشنا کیا، اور اہل دکن نے آپ سے متاثر ہو کر آپ کو بندہ نواز کے لقب سے نوازا۔ حضرت سید گیسو دراز اہل دکن کے نزدیک کس قدر بلند درجہ رکھتے تھے اس کا واضح اظہار بلگرامی کے ذیل کے بیان سے ہوتا ہے:

یکی شخصی بہ یکی از اہل دکن پرسید کہ رسول اللہؐ بزرگ تر است یا سید محمد گیسو دراز۔ جواب داد کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگرچہ پیغمبر خدا است اما سبحان اللہ مخدوم سید گیسو دراز چیزی دیگر است۔ [۵]

روضۃ الاولیاء میں گلبرگہ کے ایک مشہور تالاب کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جس کی اہمیت وخصوصیت

---

[۵] ماخذ سابق، ص: ۳۲

حسب ذیل عبارت میں بیان کی گئی ہے:

فرمود کسیکہ درین تالاب غسل سعید شود یعنی نیک بخت واز گناھا پاک می گردد اما عوام سادہ لوح گویند کہ حضرت سید فرمود کسیکہ درین تالاب غسل می کند سید می شود۔[۶]

روضۃ الاولیاء کے حوالے سے زیرِ نظر مقالہ میں جن بزرگان دین کا ذکر کیا ہے وہ تمام لوگ اپنے عہد کے درِ نایاب تھے جنہوں نے اپنے وعظ، درس و تدریس، عبادت و ریاضت اور تقویٰ کی بدولت بلند مقام حاصل کیا اور اپنے درویشانی طریقۂ کار پر اُثر انداز بیان اور جود وسخا کے سبب ہزاروں اشخاص کو راہِ حق کا راہی بنایا۔ ان تمام بزرگانِ دین کے مزار آج بھی دکن کے بیشتر علاقوں میں موجود ہیں جو حاجت مند لوگوں کے دلوں کا کعبہ ہیں۔

روضۃ الاولیاء تاریخی اعتبار سے ایک اہم ترین تصنیف ہے اس میں جو واقعات درج کئے گئے ہیں ان میں بعض ایسے ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ مثلاً، نہر قتلو، گلبرگہ کے تالاب کی خصوصیت اور سب سے اہم منتجب الدین کے سلسلہ میں معارج الولایت کے حوالہ سے بلگرامی نے جو بیان نقل کئے ہیں اس سے روضۃ الاولیاء کی تاریخی اہمیت کے سلسلہ میں معارج الولایت کے حوالہ سے بلگرامی نے جو بیان نقل کئے ہیں اس سے روضۃ الاولیاء کی تاریخی اہمیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور یہ مختصر سی تصنیف حد درجہ اہمیت وافادیت کی حامل ہو جاتی ہے۔

روضۃ الاولیاء اگر ایک جانب تاریخی اہمیت کی حامل ہے تو دوسری جانب ادبی اعتبار سے بھی بے حد اہم ہے۔ بلگرامی نے جس طرح تمام واقعات سلسلہ وار بیان کئے ہیں اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ نویسی پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا اور مختصر سی عبارت میں مکمل واقعات بیان کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ بلگرامی نے تمام واقعات سادہ آسان اور رواں زبان میں بیان کئے ہیں لیکن کہیں کہیں باوزن الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ جو فارسی زبان میں ان کی مہارت کا عین ثبوت ہے اس کے علاوہ جو چیز روضۃ الاولیاء کی ادبی اہمیت میں مزید اضافہ کرتی ہے وہ عربی زبان سے شناسائی ہے۔ جس طرح وہ فارسی کے ساتھ عربی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ بلگرامی کو صرف عربی الفاظ سے آشنائی حاصل نہیں تھی بلکہ وہ اس زبان کے ماہر استاد بھی تھے۔

---

[۶] ماخذ سابق، ص: ۴۲

پرکاش دیو کی کتاب "حضرت محمد ﷺ" کا تنقیدی مطالعہ

محمد ثاقب

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
mohdsaqib640@gmail.com

پرکاش دیو برصغیر کے علمی حلقوں میں معروف ہیں۔ صاحب نظر و قلم ہیں۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مضامین و مقالات اس پر مستزاد ہیں۔ ان کی معروف کتابوں میں، سوانح عمری بدھ دیو جی، سوانح عمری مہرشی دیوندر ناتھ ٹھاکر، سوانح عمری۔ مہاتما کیشپ چندر سین، خدا اور روح، گلدستہ اخلاق اور حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی دیگر کتابیں ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ان کی وقعت اور اہمیت ہے مگر ان کا تذکرہ یہاں اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ وہ زیر نظر موضوع سے متعلق نہیں ہیں۔

برصغیر کے غیر مسلموں میں اسلامی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کے سوانح کے مطالعہ کی ایک مسلسل روایت رہی ہے۔ یہاں کے دانشوروں نے ابتداء سے ہی اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ تاریخ کے اوراق میں ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ برصغیر کے دانشوروں، مذہبی جماعت کے ممبروں اور قائدین نے پیغمبر اسلام کی حیات ہی میں اس روایت کا آغاز کر دیا تھا۔ مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے جنوبی ہند کے راجہ چکرورتی فرماس کی تو آپ ﷺ سے لقاء ثابت کی ہے۔[1]

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں ایک ایسے وفد کا تذکرہ کیا ہے جس نے آپ ﷺ سے ملاقات کی غرض سے مکہ کا سفر کیا تھا یہ وفد اس وقت عرب پہنچا جب آپ ﷺ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیق بھی مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ وفد نے مدینہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی[2]۔ ان روایات سے اندازہ

---

[1] محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ترجمہ و توضیح پروفیسر خالد پرویز، بیکن بکس غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور، ص۱۹۹

[2] ندوی، سید سلیمان، عرب و ہند کے تعلقات، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۸، ص ۱۶۲۔۱۶۳

ہوتا ہے کہ برصغیر کے غیر مسلموں نے مطالعہ اسلام کا آغاز عہد نبوی سے ہی کر دیا تھا جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور پرکاش دیو اسی روایت اور سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

پرکاش دیو نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اردو زبان میں ایک کتاب لکھی تھی جس کو متعدد ناشرین نے مختلف ناموں سے شائع کیا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں کانشی رام پریس لاہور نے ”سوانح عمری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم بانی اسلام“ کے نام سے سب سے پہلے یہ کتاب شائع کی۔ اس کے بعد بیورو آف اسلامک پبلیکیشنز حیدرآباد نے اسی کتاب کو حضرت محمد ﷺ کے نام سے شائع کیا ہے۔

یہ کتاب سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر ہے اور تحریر عقیدت پر مبنی ہے۔ کسی غیر مسلم کے قلم سے اس طرح کی کتاب کا لکھا جانا قابل تعریف ہے۔ پرکاش دیو نے اپنی کتاب میں بعض ایسے واقعات نقل کیے ہیں جو سیرت کی معتبر کتابوں میں نہیں ملتے، انھیں یہ کہہ کر نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ غیر مسلم کی تحریر ہے۔ ایسی فاش غلطیاں صاحب قلم کو زیب نہیں دیتیں۔ واقعات کے ذکر میں مصنف نے کہیں بھی حوالے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ کتاب تعارفی نوعیت کی ہے۔ میرے پیش نظر جو نسخہ ہے اس میں کل چھ ابواب ہیں جن میں ذیلی سرخیاں بھی قائم کی گئیں ہیں۔

پہلے باب میں مصنف نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ابتدائی پچیس سالوں کے واقعات کو مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا ہے یہ واقعات عہد جاہلیت سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لیے اس عہد کے حوالے سے تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ مسلم مآخذ بھی خاموش ہیں۔ تاہم انہوں نے جو لکھا وہ عام سیرت نگاروں ہی کی طرح لکھا۔ عہد جاہلیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اہل عرب زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک اپنی آزادی، جواں مردی، شجاعت، فصاحت وغیرہ اوصاف کے سبب مشہور ہیں مگر باوجود ان عمدہ اوصاف کے اس وقت ان میں بہت سے بدرسوم بھی مروج تھیں۔ چنانچہ فسق وفجور، رہزنی، قزاقی وغیرہ اس درجہ تک بڑھی ہوئی تھیں کہ ان کے حالات پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شراب خوری کی یہ کثرت تھی کہ بچے نے دودھ چھوڑا اور شراب پینا شروع کر دی۔ انسان کی جان کا تلف کرنا ان کے لیے کچھ بڑی بات نہ تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر ایسے جھگڑے اور فساد برپا ہوتے تھے کہ صدیوں تک نہ مٹتے تھے۔ معصوم لڑکیوں کو اس خوف سے زندہ در گور کیا کرتے تھے کہ مبادا ہم کسی کے سسر کہلائیں۔ کثرت ازدواج کے مروج ہونے کے باعث عورتوں کی حالت بہت خراب تھی، مرد جس قدر چاہتا تھا عورتیں کر لیتا تھا اور جس کو جب چاہتا تھا بلا عذر چھوڑ دیتا تھا۔ کینہ، حسد اور بغض

اہل عرب میں اس قدر کہ وہاں کے جانور بھی بد خصائل میں ضرب المثل ہو گئے تھے۔ [۳]

اہل ہنود اور عربوں کی بت پرستی دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس زمانے کے اہل عرب اور اس زمانے کے اہل ہنود کا مذہب قریب قریب ایک سا تھا جن مورتیوں کی وہ پرستش کرتے تھے وہ اکثر ان نامور اشخاص کی مورتیاں تھیں، جو اس ملک میں زمانے قدیم میں ہو گزرے تھے کوئی گھر اس وقت ایسا نہ تھا جو بتوں سے خالی ہو۔ تقریباً تمام عرب میں بتوں کی خدائی ہو رہی تھی۔ غرض محمد صاحب کی پیدائش کے وقت عرب پر ایک ایسی جہالت اور تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ اس وقت اس ملک کو کل برائیوں کا منبع کہا جاتا تو بجا تھا۔ [۴]

پرکاش دیو نے پیغمبر اسلام ﷺ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے قلبی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ یہ کسی غیر مسلم کی تحریر ہے۔ انھوں نے لکھا کہ:

جس شخص نے اپنے باپ کی شفقت بھری آنکھیں نہ دیکھی ہوں، جو کنار عاطفت پدری میں آرام سے سر رکھ کر نہ سویا ہو، جس نے باپ کی محبت اور لطافت آمیز کلمات نہ سنے ہوں، جس نے پیارے باپ کی صورت نہ دیکھی ہو، جو عہد خردی میں اپنی ماں کی پیاری اور من موہنی محبت سے محروم کیا گیا ہو جو اس عمر میں کہ جب بچے اپنے والدین کے لاڈ کا لطف اٹھاتے اور بچپن کے امنگ میں ہر قسم کے کھیل کود میں شریک ہوتے ہیں، افسردہ و پژمردہ ہو کر رہ گیا ہو، وہ یتیموں کے کملائے ہوئے دلوں اور لاوارثوں کی بیکسی کو خوب سمجھتا ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ کو ان پر مصیبتوں کے ڈالنے سے بھی یہی منظور تھا کہ ان کے مزاج میں اعلیٰ درجہ کا حلم، صبر اور رحم پیدا ہو جائے اور اس ہمدردی، بردباری اور غم خواری سے اپنے ہم وطنوں کو چاہ گمراہی سے باہر نکالیں۔ [۵]

کتاب کا دوسرا باب تیرہ سے اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے آپ ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شادی، اولاد، ملک عرب کی بھلائی، جذبۂ قومی اور سنگ اسود کی

---

[۳] پرکاش دیو، حضرت محمد ﷺ، بیورو آف اسلامک پبلیکیشنز، حیدرآباد آندھرا پردیش، ص ۳۔۴

[۴] ماخذ سابق، ص ۵

[۵] ماخذ سابق، ص ۸۔۹

تنصیب، غلام کی آزادی، رغبت الٰہی، رویاء صادقہ اور قرآن مجید کا نزول، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر کا اسلام لانا، ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات، سفر طائف، حضرت طفیل اور حضرت عمر کا قبول اسلام، حضرت سودہ اور حضرت عائشہؓ سے شادی، اہل مدینہ کا ایمان لانا، شب معراج، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش، مدینہ کی طرف ہجرت وغیرہ جیسے عناوین پر مثبت انداز میں قدرے تفصیل سے بات کی ہے۔ حلف الفضول کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد وپیمان کو زندہ کیا جس کی رو سے مکہ کے اندر کسی پر کسی قسم کی بھی ظلم وزیادتی نہ ہو۔ عورتوں کی حالت زار اور مکہ کے لوگوں کی جہالت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت فکر مند رہتے تھے اور اس کے لیے سر بہ سجود روتے تھے۔[۶] مصنف نے مکہ میں مسلمانوں پر ہو رہے ظلم وستم کو اسی پیرایہ میں بیان کیا ہے جیسا کہ مسلمان سیرت نگار کرتے ہیں۔ اس سے بھی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

حضرت کے اوپر جو ظلم ہوتا تھا، اسے جس طرح بن پڑتا وہ برداشت کرتے تھے مگر اپنے رفیقوں کی مصیبت دیکھ دیکھ کر انہیں بھی تاب نہ رہتی تھی۔ ان غریب مومنوں پر ظلم وستم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ لوگ انھیں پکڑ کر جنگل میں لے جاتے اور برہنہ کر کے شدت کی دھوپ میں تپتی ریت پر لٹا دیتے اور انکی چھاتیوں پر پتھر کی سلیں رکھ دیتے۔ گرمی سے تڑپ جاتے اور مارے بوجھ کے زبان باہر نکل پڑتی۔ بہتیروں کی جانیں اس عذاب میں نکل گئیں۔[۷]

اس کے علاوہ انھوں نے اہل مدینہ کے اسلام لانے اور ان سے عہد وپیمان کے ذکر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش اور مدینہ ہجرت کی تیاری وہجرت کے واقعات کو بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

کتاب کے آخری چار ابواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا تذکرہ ہے جو اکسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں تعمیر مسجد، حضرت عائشہ سے نکاح، حضرت فاطمہ زہرا کی شادی اور جہیز، مواخات اور میثاق مدینہ، قریش کی مسلمانوں پر حملہ کی تیاری، جنگ بدر، حضرت رقیہ کا انتقال اور حضرت زینب کی مکہ واپسی، جنگ احد، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر

---

[۶] ماخذ سابق، ص ۱۵

[۷] ماخذ سابق، ص ۲۴

بہتان، غزوۂ خندق اور سلمان فارسی کا مشورہ، قریش کی شکست، بنو قریظہ کے قلعہ پر مسلمانوں کا قبضہ، صلح حدیبیہ اور اہل مکہ کی عہد شکنی، فتح مکہ، تبوک، حجۃ الوداع اور حضرت ﷺ کی وفات وغیرہ جیسے واقعات کو بہت ہی آسان اور عام فہم انداز میں لکھا ہے۔

میثاق مدینہ کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

محمد صاحب کی تعلیم اور وعظ و نصیحت نے رفتہ رفتہ قبولیت عام حاصل کر لی، ان کی نیکی کا شہرہ ہر طرف پھیل گیا، لوگوں کے دل ان کی طرف کھینچنے لگے۔ یہاں تک کہ لوگ دنیاوی معاملات میں بھی ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ جس سے محمد صاحب کی حیثیت میں بہت بڑا فرق ہو گیا۔ آخر کار یہ نوبت پہنچی کہ انھوں نے اہل مدینہ، یہودی، نصرانی، مہاجرین، انصار سب کو جمع کر کے ان سے یہ عہد و پیمان لیا کہ وہ آپس میں ساتھ رہنے کی کوشش کریں۔ اور اگر کوئی ایسا جھگڑا یا فساد برپا ہو جائے کہ وہ آپس میں نہ سلجھا سکیں تو اس کی نسبت پیغمبر خدا کی طرف رجوع کریں اور وہ جو فیصلہ کریں، اسے سب مانیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تجویز کو یہودیوں اور نصرانیوں تک نے بھی تسلیم کیا اور سب کے ساتھ ایک باقاعدہ معاہدہ تکمیل پا گیا۔[۸]

اسی طرح انہوں نے بنو قریظہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی جنگ اور ان کی سزا کو ملک کی سالمیت اور امن کی خاطر ضروری و مبنی بر انصاف قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ سزا بظاہر بہت بے دردی کی صورت رکھتی تھی لیکن جن حالات میں وہ صادر کی گئی۔ اس کے لحاظ سے غیر منصفانہ نہ تھی اور اس زمانے کی مہذب گورنمنٹ کو اگر ایسے واقعات پیش آئیں تو وہ بھی ایسے مجرموں کے لیے یقیناً یہی سزا تجویز کرے اور کچھ شک نہیں کہ دو ڈھائی سو مفسدوں کی جانوں کے مقابلے میں تمام ملک کا امن زیادہ وقعت رکھتا تھا۔[۹]

زیر نظر کتاب میں مصنف نے خطبہ حجۃ الوداع پر بھی لکھا ہے اور اس کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ کی کل زندگی کا نچوڑ سامنے آ گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

جب عرب میں یہ انقلاب روحانی ہو چکا تو محمد صاحب کو معلوم ہو گیا کہ جس مطلب کے لیے خدا نے مجھ کو پیدا کیا تھا وہ ہو چکا اور یقین کیا کہ اب میری موت کے دن قریب ہیں۔ تب انہوں نے ایک الوداعی حج کرنے کی ٹھانی، چنانچہ ذیقعدہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ مکہ کو روانہ ہو

---

[۸] ماخذ سابق، ص ۴۳۔۵۴

[۹] ماخذ سابق، ص ۷۹

مگر ناظرین قیاس کرسکتے ہیں کہ اس حج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کتنے آدمی تھے۔ وہی آمنہ کا یتیم بچہ، جسے دائی حلیمہ پرورش کے لیے لینے میں بھی تامل کرتی تھیں، وہی شخص جسے مکہ میں کوئی پناہ نہ دیتا تھا اور جسے بھاگتے وقت صرف دو جاں نثار رفیق ملے کہ ایک بستر پر لیٹا اور ایک نے ان کے ساتھ جان جوکھوں میں ڈال پہاڑ کی کھوہ میں پناہ لی۔ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج اس جھنڈے کے نیچے کتنے آدمی ہیں؟ آج اس کے ساتھ ایک لاکھ چوبیس ہزار خدا پرست میدان عرفات میں خدائے واحد کے حضور سرنگوں کھڑے بن سلے کپڑے کفن کی طرح پہنے امیری، غریبی کا فرق دور کیے میدان حشر کا نمونہ بنائے کھڑے ہیں اللہ اکبر! صداقت کی کامیابی کا کیسا عالی شان نظارہ ہے۔[۱۰]

پرکاش دیو نے اگرچہ اخلاص نیت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان کی کتاب میں بہت سی ایسی روایات ہیں جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ بغیر حوالہ جات کے روایات کا بیان اور فن سیرت سے ناواقفیت کی بنا پر ان کی سیرت نگاری تسامحات کا شکار ہوئی۔ ذاتی قیاس اور رائے کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ ایک پیغمبر سے زیادہ ایک مصلح اور حکمراں کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ کتاب میں پیش کردہ بہت سی روایات ایسی ہیں جن کا امہات کتب سیرت میں کوئی ذکر نہیں۔ اس کے علاوہ کچھ بیانات ایسے معلوم ہوتے ہیں جو سیرت نگار کی ذاتی رائے اور فہم کا نتیجہ ہیں۔ ذیل میں کچھ ایسی روایات کی نشان دہی کی جاتی ہے جو پرکاش دیو کی کتاب "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم" میں پائی جاتی ہیں۔ یہ محل نظر ہیں اور اصلاح کے قابل ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ انہوں نے پہلے باب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور نام کے بارے میں لکھا ہے کہ "مسلمانوں کی بعض روایتوں میں یوں بھی لکھا ہے کہ آمنہ نے اپنے بچے کا نام احمد رکھا تھا کیونکہ فرشتے نے انہیں خواب میں یہ کہا تھا کہ تیرے یہاں لڑکا پیدا ہوگا، اور خدا فرماتا ہے کہ تو اس کا نام احمد رکھنا۔"[۱۱]

۲۔ آپ کی پرورش و پرداخت کا تذکرہ کرتے ہوئے قبیلہ بنی سعد کے بارے میں لکھا ہے کہ "قبیلہ بنی سعد کے لوگ شہر سے دور دیہات میں رہنے والے فصاحت زبان کے لحاظ سے محض اجڈ

---

[۱۰] ماخذ سابق، ص ۱۰۷

[۱۱] ماخذ سابق، ص ۶

اور گنوار تھے آمنہ کو اس بات کا رنج کیوں نہ ہو گا ان کے بچے کے کان سب سے پہلے گنوری زبان سے مانوس ہوں، مگر اس بی بی نے اپنے بچے کی حفظ صحت کے لیے جس طرح جدائی کا صدمہ برداشت کیا۔ اسی طرح اس رنج کو خوشی سے سہا۔"(۱۲)

سیرت کی تمام کتابوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا دعویٰ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ آپ کا نام رکھنے والے خواب کا ذکر سیرت نگار نہیں کرتے۔ قبیلہ بنو سعد کی زبان پر آپ فخر کرتے تھے۔ مکہ کے اشرافیہ طبقہ کے لوگ اپنے بچوں کی پرورش وپرداخت کے لیے شہر سے باہر دیہات میں بھیجا کرتے تھے، تاکہ بچوں کے جسم طاقتور اور اعصاب مضبوط رہیں اور اپنے گھوارے ہی سے خالص اور ٹھوس زبان سیکھ لیں اسی دستور کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دایہ کے سپرد کیا گیا۔(۱۳)

۳۔ پرکاش دیو کا خیال ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ برس کی عمر میں غار حراء جایا کرتے تھے(۱۴)۔ حالانکہ کتب سیرت میں لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۵۳ سال کی عمر کے بعد غار حراء میں خلوت گزینی اختیار کی۔ آٹھ برس کی روایت کہیں مذکور نہیں ہے۔(۱۵)

۴۔ اولین وحی کے سلسلے میں پرکاش دیو نے لکھا ہے کہ "بعض مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ فرشتہ کوئی نہیں آیا، صرف ان کے دل میں ہی یہ القا ہوا تھا۔ اور خود بخود ان کی زبان سے یہ پانچ آیتیں (سورۂ علق) نکلی تھیں۔"(۱۶)

حالانکہ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیات پڑھائی تھیں، اس ضمن میں صحیح بخاری کی کتاب بدء الوحی کا باب "کیف کان بدءالوحی الی رسول اللہ" بہت واضح ہے۔

۵۔ سفر طائف سے واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطعم بن عدی کی پناہ حاصل کی اور مکہ

---

(۱۲) ماخذ سابق، ص ۷۔۸

(۱۳) نعمانی، علامہ شبلی، سیرت النبی جلد ۱، الفیصل ناشرات اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۱، ص ۱۵۵

(۱۴) پرکاش دیو، ص ۲۰

(۱۵) حمید اللہ، ص ۳۱۔۳۳

(۱۶) پرکاش دیو، ص ۱۸

میں داخل ہوئے۔ یہ روایت تو سیرت کی تمام کتابوں میں ملتی ہے لیکن یہ کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ آپ ﷺ اگلے روز ہی اس پناہ سے نکل گئے اور آپ نے حرم میں جا کر اعلان کر دیا کہ اب میں مطعم بن عدی کی پناہ میں نہیں ہوں۔ لہٰذا کوئی میری وجہ سے مطعم کو پریشان نہ کرے۔

۶۔ پرکاش دیو کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر مکان کی عقبیٰ طرف سے کود کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں گئے۔ [۱۷]

ایسی کوئی روایت کتب سیرت میں نہیں ملتی ہے۔ ہجرت سے متعلق تمام روایات میں واضح طور پر یہ چیز ملتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کے دروازے سے قریش کی آنکھوں کے سامنے سے گئے تھے اور کسی کو کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ [۱۸]

۷۔ اسلامی لشکر سے علاحدہ ہونے والے عبد اللہ بن ابی سلول اور اس کے تین سو ساتھیوں کو پرکاش دیو نے یہودی قرار دیا ہے۔ [۱۹] جبکہ وہ مسلمان تھے لیکن ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کو منافقین کہا گیا ہے۔

۸۔ مقتولین بنی قریظہ کی تعداد میں خود مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے۔ ارباب سیرت نے ۴۰۰ سے ۷۰۰ سو کے درمیان لکھی ہے۔ [۲۰] لیکن پرکاش دیو نے ۲۵۰ کی تعداد بیان کی ہے جو کہیں مذکور نہیں ہے۔

۹۔ فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان نے جب اسلام قبول کیا تو پرکاش دیو کے مطابق اس کی بیوی ہندہ نے اپنے شوہر کی داڑھی پکڑ کر جوتیوں سے پیٹا تھا کہ یہ مسلمان کیوں ہو گیا۔ اور دوسری جگہ اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں ''یہ باتیں ہو رہی تھیں ابوسفیان کی بیوی یہ سن کر کہ اس کا شوہر مسلمان ہو گیا ہے آگ بگولہ ہو کر دوڑی آئی اور اس قدر پیٹا کہ برا حال کر دیا اور لوگوں کو بہت شرمندہ کیا

---

[۱۷] پرکاش دیو، ص ۴۶

[۱۸] الطبری، علامہ ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخ الطبری، جلد اول، مترجم سید محمد ابراہیم ایم اے ندوی، نفیس اکیڈمی اسٹریچن روڈ، کراچی، اشاعت پنجم، ص ۱۲۹

[۱۹] پرکاش دیو، ص ۴۷

[۲۰] الطبری، ص ۲۹۹

کہ تمہاری غیرت کہاں گئی؟۔"[۲۱]

روایات میں یہ تو ملتا ہے کہ بیوی نے ان کو برا بھلا کہا لیکن اس قسم کی کوئی روایت کہیں نہیں ملتی کہ ابوسفیان کو جوتیوں سے پیٹا یا پیٹ کر برا حال کر دیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے ابوسفیان کی بیوی کا نام ہندہ لکھا ہے جب کہ صحیح نام "ہند" ہے یہ غلطی مسلم سیرت نگاروں کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔

۱۰۔ پرکاش دیو کے خیال کے مطابق قریش کی ایذا رسانی کی وجہ سے "بہتیرے مسلمان اپنے آپ میں ان آفتوں کی برداشت کی طاقت نہ پاکر نہایت لاچاری سے دین کو چھوڑ بیٹھے"۔[۲۲] جب کہ اس طرح کی کسی روایت کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

مختصر یہ کہ پرکاش دیو صاحب نے کتاب کو عقیدت سے لکھا ہے مگر عقیدت کے اظہار کے لیے انھوں نے تحقیق کا سہارا نہیں لیا اور نہ ہی واقعات کے بیان میں تنقیدی نظر ڈالی، اسی لیے بعض واقعات کی تشریح میں تسامحات در آئے ہیں۔ دوسری بڑی وجہ عربی زبان سے عدم واقفیت، مطالعے کی کمی اور اسلامی بنیادی مآخذ سے لاعلمی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے یہاں کسی بھی روایت یا واقعہ کا حوالہ نہیں ملتا ہے، اس کے باوجود کتاب قابل مطالعہ ہے۔

---

(۲۱) پرکاش دیو، ص ۵۵۔۵۴

(۲۲) پرکاش دیو، ص ۲۴

اسلام کس طرح ایک اخلاقی زندگی پیدا کرتا ہے؟

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

شہریوں میں اخلاقی اقدار پیدا کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک وہ ہے جو سیکولر حکومتوں نے اپنایا ہے جس میں انھوں نے سخت قوانین، پولیس، عدلیہ اور جیل کا سہارا لے کر شہریوں کے دلوں میں قانون کا خوف بٹھایا ہے۔ اس نظام میں انسان "غلط" کام اس لئے نہیں کرتا ہے کہ قانون کا شکنجہ اسے پکڑ لے گا، پولیس اسے گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کرے گی اور اس کو جیل یا بعض حالات میں عمر قید و پھانسی تک کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ مغربی ممالک میں یہ نظام کافی کامیاب ہے حالانکہ وہاں بھی جرائم موجود ہیں لیکن اگر کوئی غلط کام کرتے ہوئے پایا جاتا ہے تو اسے بخشا نہیں جاتا۔ وہاں رسوخ اور پیسے خرچ کر کے کوئی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ اس کی مثال امریکہ کے ایک طاقتور ترین صدر رچرڈ نکسن کی ہے جن کو جون ۱۹۷۲ میں مخالف پارٹی کے صدر دفتر میں جاسوسی کے لئے کچھ لوگ بھیجنے پر بالآخر صدارت چھوڑنی پڑی تھی۔ اس اسکینڈل کو عرف عام میں واٹر گیٹ اسکینڈل کہتے ہیں کیونکہ مخالف پارٹی کا آفس واٹر گیٹ بلڈنگ میں تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل برطانیا کے وزیر اعظم بورس جانسن کو اپنا عہدہ اس لئے چھوڑنا پڑا کہ کورونا کی سختیوں کے دوران انھوں نے اپنے سرکاری گھر میں ایک پارٹی رکھی تھی اور ان کے ایک مشیر نے کورونا کی پابندیوں کو توڑ کر لمبا سفر کیا تھا لیکن وزیر اعظم نے ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اسپین کے بادشاہ خوان کارلوس کو کرپشن کے کیسوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے تخت و تاج چھوڑ کر ملک سے بھاگنا پڑا اور اب وہ متحدہ عرب امارات میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اس قسم کے سخت قانون صرف مغربی ممالک یعنی مغربی یورپ، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں پائے جاتے ہیں اور ان پر سختی سے عمل بھی ہوتا ہے۔ دوسرے ممالک میں، بشمول ہندوستان، ایسے قانون موجود ہیں لیکن سیاستدانوں، مالدار لوگوں اور رسوخ رکھنے والوں پر کوئی قانون نافذ نہیں ہوتا اور وہ سب کچھ کرتے ہوئے دھڑلّے سے عزت دار بن کر معاشرے میں رہتے ہیں اور کوئی ان کو اپنے سیاسی مناصب یا لوٹ کھسوٹ کے پیسے سے دستبردار ہونے یا جیل جانے کی

بات نہیں کرتا سوا اس کے کہ وہ حکومت وقت کے مخالفین میں ہوں۔ یوں لوگوں میں قانون اور پولیس کے ذریعے اخلاقی زندگی سے پیدا کرنے کا نسخہ مغربی دنیا کے باہر شاذونادر ہی چلتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے اس مسئلے کو دوسرے طریقے سے حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت میں بھی پولیس، عدالتیں اور جیلیں وغیرہ تھیں اور رہیں گی لیکن اسلام نے ہم کو بتایا ہے کہ اللہ پاک نے انسان کو ایک پلان کے تحت پیدا کیا ہے تاکہ اس کا امتحان لیں اور اسی کی بنیاد پر آخرت کی ابدی زندگی میں اس کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا (سورہ ہود:۷)۔ اسلام نے یہ بھی بتادیا کہ جب اللہ پاک نے انسان کو پیدا کیا تو اس کے اندر اچھائی اور برائی دونوں کا علم ودیعت کر دیا (سورہ شمس: ۸)۔ ہر آدمی فطرتی طور سے جانتا ہے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر اس کا آخرت میں حساب ہوگا اور ہر ایک انسان کو اپنے ذرہ، ذرہ بھر اچھے یا برے عمل کا ثواب یا عقاب ملے گا (سورہ زلزال:۸)۔ دوسرے لفظوں میں اسلام ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ پاک نے ہر انسان کے اندر اچھائی اور برائی کا علم و شعور ودیعت کر دیا ہے اور وہ اس دنیا میں آنے کے بعد دو فرشتوں "کراماً کاتبین" (الانفطار: ۱۱) کے ذریعے ہمارے ہر قول و فعل کو رجسٹر کر رہے ہیں اور وہ ریکارڈ ہمارے سامنے آخرت کے دن پیش کر دیا جائے گا یہاں تک کہ اس دن آدمی چیخ پڑے گا کہ یہ کیسا ریکارڈ ہے جو چھوٹی بڑی کوئی بھی چیز نہیں چھوڑتا ہے (الکہف: ۴۹)۔ اس کے علاوہ اللہ پاک نے اپنے پیغمبروں کو ہر علاقے کے لوگوں میں اپنا پیغام اور صحیح وغلط کا علم عام کرنے کے لئے بھیجا، جس کی آخری کڑی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

اللہ پاک نے ہر انسان کے اندر ایک محتسب اور ایک پولیس والا بٹھا دیا ہے جو اس کو خبردار کرتا رہتا ہے کہ یہ کام غلط ہے، اسے نہ کرو، اور یہ کام درست ہے اسے کرو۔ یوں ہر مؤمن فطری طور پر اپنی فطرت کے مطابق صحیح کام کرتا ہے اور غلط کام سے بچتا ہے۔ پیغمبر بھیج کر اللہ پاک نے اس علم کو اور راسخ کر دیا۔ اس کے باوجود ہم میں سے بہت لوگ ہیں جو اپنے ضمیر کی آواز کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور الٰہی ہدایات کو جانتے ہوئے غلط کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو آخرت میں شدید ترین عذاب ہوگا اور وہ وہاں ساری دنیا کی مال و دولت فدیہ کے طور پر بھی ادا کر کے (آل عمران: ۹۱؛ المائدہ: ۳۶؛ یونس: ۵۴؛ الرعد: ۱۸ وغیرہ) نہیں بچ سکتے بلکہ ان کو اپنے چھوٹے سے چھوٹے گناہ اور عمل صالح کا بدلہ مل کر رہے گا۔ وہاں کوئی سفارش بھی نہیں چلنے والی ہے۔

فطری طور پر صحیح اور غلط کو جاننے کی بات کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی غلط کام کر کے چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑا آدمی بھی غلط کام بالعموم چھپ کر کرتا ہے۔ رسول اللہ

ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ غلط وہ ہے جو تمہارا دل کہے کہ یہ غلط ہے حالانکہ کتنے ہی لوگ تمہیں اس کے صحیح ہونے کا فتوی دیں۔ (مسند احمد اور طبرانی)۔

بارہویں صدی عیسوی کے ایک عالم ابن طفیل (م:۱۱۸۵ء) نے، جو اندلس میں ایک بڑے عالم تھے، اس حقیقت کو ایک ناول کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ناول کا نام "حي بن يقظان" ہے۔ اس ناول میں ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح ایک جزیرے پر ایک شیر خوار بچہ پہنچتا ہے۔ شاید اس کی کشتی طوفان کا شکار ہو گئی تھی یا ایسا ہی کوئی حادثہ پیش آیا تھا اور اس جزیرے پر کوئی انسان نہیں تھا۔ ایک ہرنی اس بچے کی پرورش کرتی ہے یہاں تک کہ وہ بڑا ہو جاتا ہے اور بہت بعد میں ایک شخص دوسرے جزیرے پر رہنے والے انسانوں کے رابطے میں آتا ہے۔ یوں اکیلے پرورش پانے کے باوجود وہ بچہ صحیح اور غلط کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ یہ شعور اس کے اندر اللہ پاک نے انسان کی تخلیق کے وقت ہی ودیعت کر دیا تھا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے وضعی نظام میں قانون، پولیس اور جیل کے ذریعے لوگوں میں اخلاقی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن وہ بالعموم ناکام ہے۔ اس کے برعکس اللہ پاک نے فطری طور پر ایک نظام بنایا ہے جس میں انسان خود اپنا محتسب ہے اور غلط کو غلط جان کر اس کا ارتکاب نہیں کرتا ہے اور صحیح کو صحیح جان کر اس پر عمل کرتا ہے۔ کسی بھی صحیح اور صحتمند اسلامی معاشرے میں پولیس اور جیل وغیرہ کی بہت زیادہ ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ لوگ خود ہی اپنے ضمیر کی آواز پر اور اللہ کے خوف سے غلط کام سے بچتے ہیں اور صحیح کام کرتے ہیں۔ [1]

---

[1] اعظم گڑھ کے شبلی کوچنگ سنٹر کے طلبہ وطالبات سے خطاب

وفیات

آہ! ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی ندوی

(۱۹۴۶ء۔ ۲۰۲۴ء)

محمد عمیر الصدیق ندوی

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی ندوی کے انتقال کی خبر گذشتہ مہینے کے معارف میں دی گئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے نہ ہونے کا احساس بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ان کا شمار ان اشخاص میں نہیں کیا جاسکتا جو اردو ادب کی محفلوں یا موجودہ ماحول کے لحاظ سے اردو کے بازاروں میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں خاموش طبیعت اور عزلت پسند انسانوں میں تھے۔ اور شور شرابے سے دور رہ کر علم و ادب کی خدمت میں یکسو ہو کر وقف رہنے کی برکتوں کو ظاہر کرتے رہتے تھے۔ معارف نواز تھے۔ لیکن ادھر ایک دو برس سے ان کا کوئی مضمون یا خط یا کوئی تحریر نہیں آئی، کبھی کبھار فون پر جو خیر و خیریت کی خبر ملتی تھی، وہ بھی موقوف تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اس خاموشی کا سبب بھی معلوم نہیں کیا جاسکا اور اب اس کی تلافی کی کوئی شکل بھی نہیں۔ بس ذکر صرف ان کی شرافت اور عجب سی معصومیت ہی کا ہو سکتا ہے۔ واقعہ ہے کہ ان کے نہ ہونے سے قلم کی شرافت اور اسلوب اور لہجہ کی معصومیت کے اٹھ جانے کا غم کچھ اور بڑھ گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے قریب اٹھہتر سال کی عمر پائی، کبھی کے عظیم آباد اور اب پٹنہ کے قریب ایک گاؤں مکامہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم دیوبند اور پھر ندوۃ العلماء سے استفادہ کیا، سندیں حاصل کیں، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ایم اے اور پٹنہ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ بھی کیا، ۱۹۷۶ء میں خدابخش لائبریری سے وابستہ ہوئے اور اس کے نہایت اہم شعبہ مخطوطات کی ذمہ داری تیس سال تک نبھائی۔ ۲۰۰۶ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ لیکن علم و ادب سے آخر آخر تک وابستگی اور وفاداری استوار رہی۔

اس وابستگی کا اظہار ملک کے مختلف سمیناروں میں ان کی شرکت سے بھی ہوتا رہا۔ اعظم گڑھ، بھوپال، حیدرآباد، دہلی، رام پور، پونے اور پٹنہ وغیرہ میں مختلف اداروں، جامعات اور انجمنوں میں ہونے والے علمی مذاکروں میں وہ بڑے شوق سے شامل و شریک ہوتے رہے۔ عربی اور اسلامی

ادب ان کے فکر و نظر کا اصل محور تھا۔ انہوں نے ان سمیناری مقالات کا ایک مجموعہ بھی شایع کیا جس میں عرب و ہند کی علمی خدمات پر ان کی تحریروں کا انتخاب تھا۔ ادب اسلامی ان کا خاص موضوع بن گیا تھا، اسی وجہ سے وہ رابطہ ادب اسلامی کی پٹنہ شاخ کے صدر کے عہدہ پر فائز ہوئے، جہاں انہوں نے اردو میں قصہ نگاری کے موضوع پر سمینار کرایا جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت وقیع اور مفید ثابت ہوا۔ انہوں نے اس میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ بھی شایع کیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ انہوں نے اعلیٰ درجہ کی تحقیق کے ساتھ 'عورت قرآن کریم کے آئینہ میں' نام سے ایک خاصی ضخیم تصنیف بھی شایع کی، قرآن و حدیث کی مختلف تفسیروں اور تشریحوں سے مدلل اور مزین یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیائی اہمیت کی بتائی گئی۔ موضوعاتی ترتیب نے اس کی جامعیت کو کاملیت عطا کر دی۔ وقت کی ایک اہم ضرورت کے لحاظ سے اس کتاب کی داد مولانا سید محمد رابع ندویؒ نے یہ کہہ کر دی کہ اس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی کیا جانا چاہیے۔ لیکن ان کے جس علمی کارنامے نے بزرگوں کی نگاہ التفات کا ان کو مرکز بنایا وہ ان کا تحقیقی مقالہ تھا۔ علامہ شوق نیموی صاحب آثار السنن اور علم حدیث میں ان کی خدمات پر عربی زبان کا یہ مقالہ، ان کی شہرت کا ضامن بن گیا۔ ۲۰۱۰ء میں مرکز البحوث الاسلامیہ، پٹنہ نے اس کو خوبصورت طباعت سے آراستہ کرکے شایع کیا، محدث شہیر مولانا تقی الدین ندوی نے اس کے "اسلوب جید اور منہج سلیم" کی داد دی۔ دس ابواب میں ہندوستان میں علم حدیث اور چار ابواب میں محدثین ہند کا ذکر کیا گیا اور باقی ابواب میں علامہ شوق نیموی کے سوانح اور ان کی محدثانہ اہمیت پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ عربی میں ان کا ایک اور مجموعہ مقالات رجال العرب والہند کے نام سے بھی طبع ہوا۔ علامہ شوق نیموی پر بعد میں ان کی ایک کتاب اردو میں بھی شایع ہوئی جس میں علم حدیث کے ساتھ ان کے شاعرانہ اور ادیبانہ اوصاف و کمالات کو بھی شامل کرلیا گیا۔ اس لحاظ سے یہ اردو ایڈیشن اور زیادہ پر از معلومات ہو گیا۔ خدا بخش لائبریری میں صحیح بخاری کا نہایت اہم اور نایاب نسخہ ہے جس پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے کئی حواشی ہیں۔ مرحوم نے ان حواشی کو مرتب کرکے شاہ ولی اللہ کی تحقیقات حدیث کے نام سے شایع کر دیا۔ بقول پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی مرحوم، اس کتاب سے حضرت شاہ کے علم و فن کی خدمت تو بن آئی ہی اس سے بڑھ کر حدیث و سنت کی خدمت بن گئی۔ اسی طرح ان کو لائبریری میں شاہ صاحب دہلوی کے ہاتھ کا ایک اجازت نامۂ حدیث دستیاب ہوا جو شاہ صاحب کے شاگرد شیخ محمد بن پیر محمد الہٰ آبادی کے لیے تھا۔ اس کو بھی انہوں نے بڑے اہتمام سے شایع کر دیا۔ ان کی ان مسلسل علمی و تحقیقی خدمات کا اعتراف صدر جمہوریہ ہند کی

سند قابلیت کی شکل میں سامنے آیا۔ آخر عمر میں وہ کچھ وقت اپنے صاحبزادے احیاء الاسلام کے ساتھ دبئی میں گزارنے لگے۔ قویٰ مضمحل ہونے لگے تھے لیکن ان کے شوق تحقیق و تالیف کا اعتدال بہرحال قائم رہا۔ دبئی گئے تو شیخ جمعہ الماجد سے متاثر ہوئے اور ایک رسالہ ان کے اور ان کی علمی خدمات کے تعارف پر تیار کردیا اور خود دبئی کو انہوں نے جس نظر سے دیکھا وہ سارا جلوہ، نقوش دبئی کے نام سے اس طرح پیش کردیا کہ وہاں کی تاریخ، قدیم وجدید کے ساتھ وہاں کی مسجدیں، تعلیمی و تحقیقی ادارے، بازار، تفریح گاہیں، مصنوعات اور پھر تہذیبی، سماجی اور معاشی صورت حال، اخبار ووسائل سب سے انہوں نے دبئی کی ظاہری خوبصورتی اور رونق کی طرح، اپنے سفر نامہ کو بھی آراستہ کردیا۔ لیکن آخر میں انہوں نے بڑی سچائی سے کہہ دیا کہ وہاں جدید تعلیم سے دلچسپی تو ہے لیکن اعلیٰ سائنسی تعلیم سے غفلت بھی ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس غفلت کا احساس کسی کو بھی نہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف ان کو اس سچائی سے ہوئی کہ وہاں خالص دینی تعلیم کے لیے مدارس نہیں۔ اسی طرح دعوت وارشاد کے ادارے بھی بہت کم ہیں۔ ان کے یہ احساسات کوئی وقتی نہیں تھے ان کے نام مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی ہے، ان خطوط کے بین السطور سے بھی ڈاکٹر صاحب کی دینی فکر صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اور اسی سے ان کے علم وفضل اور فکرونظر کی سلامتی اور اصابت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خودنمائی اور خودستائی کی عام وبا کے دور میں بھی حتی المقدور قلم و قرطاس سے اپنا فرض اخلاص نیت سے ادا کرتے رہے۔

خاص بات یہ ہے کہ علم کی طلب میں انہوں نے تحفظات ذہنی وفکری کو کبھی جگہ نہ دی، ان کی کتاب مشاہیر کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا وحید الدین خاں سے قیوم خضر اور عارف ماہر آروی تک وہ ہمیشہ سچے طالب علم کی صورت نظر آئے۔ رسالہ معارف ان کو سب سے محبوب تھا اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اسی رشتے سے ان کا مرکز محبت وعقیدت بن گئے۔ وہ جب بھی دارالمصنّفین آتے تو ان حضرات کے ذکر سے زبان کو تر بلکہ اپنے وجود کو سرشار کرتے رہتے۔ دارالمصنفین کے دوسرے خادموں سے بھی وہ اس طرح ملتے کہ خادم و مخدوم کا مفہوم خلط ملط ہوجاتا۔ افسوس ہمیشہ رہے گا کہ وہ اگر اپنی بیماری سے خاموش سے ہوگئے تھے تو اس سکوت کے عالم میں خیریت طلبی کی کوئی تحریک ان سے محبت کرنے والوں سے کیوں نہ ہوئی۔ ایسے مخلص اور معصوم صفت انسانوں کی کمی واقعی محرومی اور خسارے کی اذیت کا سبب بن جاتی ہے۔ دعا ہے تو یہی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی ردائے رحمت سے ڈھانپ لے۔ آمین

باب التقریظ والانتقاد

تلخیص تدبر قرآن (جلد اول ودوم)[1]

مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی

کلیم صفات اصلاحی

قرآن مجید پر غور وفکر، اس کے پیغام کی تبلیغ و تشہیر، نشر واشاعت اور تدریس و تعلیم سے بڑھ کر دنیا کا کوئی بابرکت وباعظمت کام ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے خوش نصیبوں کو زبان رسالت مآب ﷺ کی جانب سے خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ کی روح افزا بشارت ملی ہوئی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا شمار ان ہی خوش بختوں میں ہے جن کی حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ علوم و تفسیر قرآنی کے بحر ناپیدا کنار کی غواصی میں گذرا اور انہوں نے تدبر قرآن کے نام سے ایسی منفرد، نظم قرآن کی حامل، غیر مستند واقعات و روایات سے حتی المقدور خالی اور سب سے بڑھ کر القرآن یفسر بعضہ بعضاً کے اصول کے مطابق تفسیر لکھ کر دنیا کو دی جس کی نظیر ماہرین علوم قرآنی کے مطابق دوسری زبانوں میں کیا خود عربی میں بھی مفقود ہے۔ صاحب تدبر کا اعتراف ہے کہ مولانائے مرحوم کا یہ تفسیری ذوق ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تربیت والتفات نظر اور ان کی خصوصی توجہ کا رہین منت ہے۔

مولانا نے نو ضخیم جلدوں پر مشتمل اس تفسیر میں براہ راست قرآن فہمی کا وہ نہج اختیار کیا جس پر صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور سلف صالحینؒ گامزن تھے۔ اسی لیے اس میں عام تفسیری اقوال وعدیم الصحہ احادیث شاید باید ہی ملیں گی۔ اس تفسیر کا مقصد مقدمے میں مولانا نے یہ بیان کیا ہے کہ ہر قسم کے بیرونی لوث ولگاؤ اور ہر قسم کے تعصب و تحزب سے آزاد ہو کر ہر آیت کا وہ مطلب سمجھوں اور سمجھاؤں جو فی الواقع اس سے نکلتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مولانا نے فہم قرآن کے داخلی ذرائع قرآن کی زبان، اس کے اندر موجود نظم اور اس کے نظائر وشواہد وغیرہ اور خارجی وسائل حدیث، تاریخ، صحف سماوی اور کتب تفاسیر وغیرہ کو داخلی وسائل کے تابع رکھ کر ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان خصائص وامتیازات سے متصف ہو کر جب یہ تفسیر منظر عام پر آئی تو اہل علم

---

(۱) البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۲۰۲۳ء، جلد اول ودوم، قیمت: ۲۶ سو روپے

وصاحبان تحقیق و تدقیق نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اللہ کے فضل سے اس کا شمار اردو زبان کی ان مشہور و مقبول تفسیروں میں ہونے لگا جو سب سے زیادہ متداول اور پڑھی جانے والی ہیں اور جن کی جانب شائقین علوم قرآنی نحوی اشکالات، حل لغات اور تفہیم معانی و مشکلات کے وقت رجوع کرتے ہیں اور مطمئن و فائز المرام واپس جاتے ہیں۔

مولانا اصلاحیؒ نے اس کی تحریر و تسوید میں اپنی عمر عزیز کا کتنا وقت صرف کیا؟ اس پر غور و تدبر کا ان کا کیا انداز تھا؟ رموز و اسرار قرآنی کی تہ تک پہنچنے کے لیے انہوں نے کس قدر پتہ ماری کی اور کس قدر خون جگر جلایا، یہ اور اس قسم کی تمام تفصیلات مولانا نے تدبر قرآن کے دیباچہ میں بہم پہنچائی ہیں جن کا مجملاً تذکرہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

صاحب تدبر کے بقول ان کی یہ تفسیر چالیس سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کی تکمیل میں انہوں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ صرف کیا۔ قرآن کی ایک ایک سورہ پر ڈیرے ڈالے ہیں۔ ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادبی یا نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اس پتھر کو الٹنے کی کوشش کی ہے جس کے نیچے انہیں کسی سراغ کی توقع ہوئی ہے۔ مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں اپنے رب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اس کتاب میں کسی ایک آیت کی بھی ایسی تفسیر نہیں کی ہے جس میں مجھے کوئی تردد ہو۔ جہاں ذرا بھی کوئی تردد ہوا ہے میں نے بے تکلف اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اسی طرح کسی ایک مقام میں بھی میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ کسی ایک آیت کو اس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنے کسی نظریے یا کسی خیال کی تائید کے لیے استعمال کروں۔ مولانا کے اس بیان کی صداقت کا اندازہ صفحات تدبر پر نگاہ ڈالنے والوں کو بہ خوبی ہو گا۔

یہ بھی عجیب و غریب حسن اتفاق ہے کہ قرآن میں جتنی آیتیں ہیں تدبر قرآن میں کم و بیش اتنے ہی صفحات اور اس کے نزول کی جو مدت ہے وہی مدت اس کے زمانۂ تسوید و تحریر کی بھی ہے۔ دیباچہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> یہاں ان دو باتوں کا ذکر بھی قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو گا جو حسن اتفاق کے طور پر اس کتاب سے وابستہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی کل آیات ۶۲۳۶ ہیں اور ان کی تفسیر، تدبر قرآن کے کم و بیش اتنے ہی صفحات میں آئی ہے۔ گویا ہر آیت کی تفسیر کے لیے اس کتاب کا تقریباً ایک صفحہ مختص ہوا۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید کا زمانۂ نزول ۲۳ سال ہے اور تدبر قرآن کا

زمانۂ تحریر و تسوید بھی ۲۳ سال ہے۔ میں اس باب میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ ذلک تقدیر العزیز العلیم۔

مولانا اصلاحی کی اس مہتم بالشان اور ضخیم تفسیر سے مکمل استفادہ عام قارئین کے لیے آسان نہیں۔ اس لیے کہ شروع سے آخر تک اس کے مطالعہ، اس کی عطر بیزیوں سے مسام قلب و نظر کو معطر کرنے اور اس خزینۂ بے بہا کے لعل و جوہر سے دامن بھرنے کے لیے یقیناً ایک عرصہ چاہئے۔ کسی چیز کی شکایت ہو نہ ہو لیکن عدیم الفرصتی کا شکوہ تقریباً ہر شخص کی زبان پر ہے اور آج یہی چیز سب سے زیادہ قیمتی اور بیش بہا ہو گئی ہے۔ اسی عام احساس و خیال اور شکوۂ بیجا کے پیش نظر ایک مدت سے اس کی تلخیص کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ تاہم اس اہم اور انتہائی دقت و وقت طلب کام کا بیڑا کون اٹھاتا؟ بالآخر قرعۂ فال مدرسۃ الاصلاح کے نامور استاد تفسیر اور نظام القرآن کے مدیر مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی کے نام نکلا جن کو فکر فراہیؒ و اصلاحیؒ سے بہت حد تک مناسبت ہے۔ انہوں نے خواہش صلہ و ستائش کے بغیر نہایت خاموشی و خوش اسلوبی سے جس طرح اس ہفت خواں کو طے کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اس کے لیے وہ قابل صد تحسین و مستحق تبریک ہیں۔

صاحب تلخیص کو تدریس قرآن کا طویل تجربہ اور اس میدان میں مہارت حاصل ہے۔ ایک مدت سے وہ اس دینی، علمی و تعلیمی شغل میں مصروف ہیں۔ انھوں نے اپنے دیرینہ اور عمدہ تصنیفی و تالیفی ذوق کے دائرے کو بھی قرآنیات کی جولان گاہ تک محدود رکھا ہے۔ ان کی اہم تصنیفات قرآنیات پر ہی ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا اس قرآنی خدمت کے لیے موزوں شخص تھے۔

مولانا نے ۶ ہزار سے زاید صفحات پر مشتمل تدبر قرآن کی تلخیص دو جلدوں میں کی ہے۔ البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی نے اس کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ دونوں جلدوں کے کل صفحات ۱۸۷۴ ہیں۔ پہلی جلد ۹۴۴ اور دوسری ۹۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں سورہ فاتحہ سے سورہ طٰہٰ تک صرف بیس سورتوں کی تلخیص ہے اور دوسری جلد میں سورتوں کی تعداد ۹۴ ہے۔ مقدمہ تدبر ۳۰ صفحات میں ہے۔ مولانا نے اس کو چھ صفحہ میں سمیٹ دیا ہے۔ آیت بسم اللہ کی تفسیر تدبر میں ۵ صفحوں پر مشتمل ہے مولانا نے اس کا خلاصہ ۲ صفحے اور سورہ فاتحہ کے ۱۹ صفحات کا خلاصہ ۳ صفحے میں کر دیا ہے۔ اسی طرح طوال و اوساط مفصل پر مشتمل سورتوں کی تلخیص میں مولانا نے جس طرح کمال مہارت سے صفحات کم کیے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فن تلخیص نگاری اور اس کے

اصولوں سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ ڈھائی پارہ پر مشتمل سورہ بقرہ کے ۵۷۷ صفحات کی تلخیص صرف ۱۷۷، سورہ آل عمران کے ۲۲۸ صفحات کی تلخیص ۸۳ صفحات میں کی ہے۔ سورہ مزمل کی ۲۰ اور سورہ مدثر کی ۳۵ صفحات کی تلخیص بالترتیب ۶ اور ۸ صفحات میں ہے۔ آخری پارۂ عم میں کل ۳۷ سورتیں ہیں۔ صاحب تدبر نے اس کی تفسیر پر ۵۲۹ صفحات صرف کئے ہیں، مولانا نے یہ پورا مواد ۱۴۹ صفحات میں سمیٹ دیا ہے۔ اس قدر طویل مواد کو کم کرنے کے لیے مولانا کو تدبر قرآن کی نو جلدوں کے ہر صفحہ کا بار بار بالاستعاب، گہرائی، دقت نظری اور باریک بینی سے مطالعہ اور لفظ لفظ پر پورے انہماک سے غور کرنا پڑا ہوگا۔

تلخیص میں سب سے ضروری چیز جو پیش نظر رکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ خلاصہ کرتے وقت مواد کا کوئی ایسا ضروری پہلو چھوٹنے نہ پائے جس کی وجہ سے بحث میں تشنگی یا عدم تکمیل کا احساس ہو، مولانا نے اس امر کا پورا لحاظ کیا ہے۔ تلخیص میں مولانا نے جن امور کا لحاظ کیا ہے پیش لفظ میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مثال کے طور پر مولانا کے بقول تلخیص میں تدبر قرآن کے ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے، ممکن حد تک صاحب تدبر کے الفاظ ہی شامل کیے گئے ہیں، بیشتر مقامات پر آیات اور قدیم صحیفوں کی عبارتوں کے بجائے ان کے حوالوں پر اکتفا کیا گیا ہے، تفسیر سے براہ راست غیر متعلق اضافی بحثیں حذف کر دی گئی ہیں۔ بعض جگہوں پر تلخیص انہیں الفاظ میں دشوار تھی تو مولانا نے اپنے الفاظ میں ان کی وضاحت کی ہے لیکن ایسے مقامات کے لیے کسی علامت فصل کے استعمال کی نہ پیش لفظ میں نشان دہی کی گئی ہے اور نہ ہی دوران مطالعہ ایسی کسی علامت پر بہ ظاہر نظر پڑی کہ جس سے اندازہ ہو تا کہ یہ الفاظ صاحب تلخیص کے ہیں۔ بعض پیش رو تلخیص نگاروں نے اس امر کا پورا لحاظ کیا ہے اور جہاں جہاں حسب ضرورت اپنی عبارتیں لکھی ہیں وہاں قوسین یا کسی دوسری علامت کے اندر درج کی ہیں۔ اس سے ان کی اپنی عبارت الگ ہو گئی ہے اور مفسر و ملخص کی عبارتوں میں باہم خلط ملط بھی واقع نہیں ہوا اور علمی دیانت کا تقاضہ بھی پورا ہو گیا ہے۔

تلخیص میں مواد کی پیش کش کا وہی اسلوب و انداز اختیار کیا گیا ہے جو تدبر کا ہے۔ یعنی پہلے سورہ کے مضمون، عمود، اسلوب اور سورہ کے مطالب کا تجزیہ، اس کے فوراً بعد حسب گنجائش صفحات پر آیات، پھر ترجمہ، اس کے بعد تفسیر و تحقیق الفاظ کا خلاصہ۔

تلخیص کا عام انداز یہ ہے کہ ہر صفحے پر پہلے چند آیتیں، اس کے بعد ان کا ترجمہ، پھر ترجمے میں نمبر دے کر نیچے بالترتیب ان آیتوں کی ملخص تفسیر نقل کی گئی ہے تاکہ قاری آیتوں کا ترجمہ اوران

کا خلاصہ اسی صفحے پر پڑھ لے۔ مطلب کے ساتھ ساتھ اس کا خلاصہ بھی فی الفور اس کے ذہن نشین ہو جائے اور وہ طویل ورق گردانی سے بچا رہے جیسا کہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے تلخیص تفہیم القرآن میں اور صاحب تدبر کے شاگرد رشید خالد مسعود نے ان کے ترجمۂ قرآن کی اپنی تلخیص میں اختیار کیا ہے اور یہ ہر لحاظ سے مناسب اور عام قاری کے لیے آسان تھا۔ صاحب تلخیص کے لیے اس عام اور مانوس اسلوب کو اختیار کرنا بوجوہ دشوار تھا۔

صاحب تلخیص کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ صاحب تدبر سے آیتوں کے بعض ٹکڑوں کا ترجمہ رہ گیا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۵ میں "حتی یبلغ الکتب اجلہ" اور "واعلموا ان اللہ غفور حلیم" کے درمیان "واعلموا ان اللہ یعلم ما فی انفسکم فاحذروہ" (خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال جانتا ہے لہذا اس سے ڈرو) اور سورہ انفال کی آیت ۳۷ لیمیز اللہ الخبیث من الطیب ویجعل الخبیث بعضہ علیٰ بعض فیرکمہ جمیعا فیجعلہ فی جہنم میں "فیرکمہ جمیعا" کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ تدبر میں اس قسم کی اور بھی آیتیں ہیں جن کے ترجمے کی جانب توجہ کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ایک مبتدی یا قرآن کا طالب علم تلخیص کے ساتھ جب ان لفظوں کے ترجمہ پر سرسری نگاہ بھی ڈالے گا تو وہ اس خلا کو ضرور محسوس کرے گا۔ چونکہ صاحب تلخیص نے خود کو آیتوں کی تفسیر تک محدود رکھا ہے۔ ترجموں پر غور وفکر ان کے دائرہ کار سے خارج تھا، غالباً اسی لیے وہ اس جانب متوجہ نہیں ہوئے۔ اگر اس قسم کی تمام متروک الترجمہ آیات کے سامنے قوسین یا حاشیے میں ترجمہ کا اضافہ کر دیا جاتا تو اس اہم علمی خدمت کی افادیت مزید بڑھ جاتی۔

جہاں تک تلخیص تدبر قرآن کی افادیت، اہمیت اور اس کی ضرورت کا معاملہ ہے تو یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کی یہ قرآنی خدمت واقعتاً وقیع، قابل قدر اور ہر لحاظ سے طلبہ وطالبات کے لیے مفید و نفع بخش ہے۔ مولانا نے جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی تلخیص آسان زبان وبیان میں کی ہے، اس میں بلاشبہ وہ کامیاب ہیں۔ تلخیص کے مطالعہ کے بعد تدبر کے تفصیلی مطالعہ کے لیے قاری کی آتش شوق کا مزید بھڑکنا لازمی ہے۔ امید ہے کہ یہ تلخیص ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

تبصرۂ کتب

مولانا ابو العلا محمد عبد الرحمٰن مبارک پوری، ترجمہ و تخریج از مولانا اشد حسن مبارک پوری، **القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید اور خیر الماعون فی منع الفرار من الطاعون**، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: بالترتیب ۲۱۰، ۲۸۴ پتہ: دار المقتبس، دمشق، سوریا، پوسٹ بکس ۳۴۳۶، اور بیروت، لبنان، پوسٹ بکس ۱۴/۶۷۵۹

محدث کبیر علامہ محمد عبد الرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی کی علمی خدمات سے ہندوستان کے علوم اسلامیہ کا کوئی محقق اور عالم و محدث بے نیاز نہیں ہو سکتا، اسماء الرجال، جرح وتعدیل، محدثین کے طبقات اور احادیث شریفہ کی تخریج جیسے مضامین میں ان کے علم وحفظ واتقان پر علمائے عرب و عجم سب کا اتفاق ہے۔ تحفۃ الاحوذی ان کے مآثر علمیہ میں شاہکار ہے، لیکن اس کے علاوہ ان کے بیسیوں چھوٹے بڑے رسائل و مؤلفات ہیں جن کی شان بھی جدا اور نمایاں ہے۔ ان میں پیش نظر یہ دونوں رسالے بھی ہیں۔ یہ اس دور کی یادگار ہیں جب فقہی وکلامی مباحث میں اہل علم کے ساتھ عام مسلمانوں کو بھی زیادہ دلچسپی تھی۔ اور عیدین کی نماز میں تکبیرات زائد کا شمار یا طاعون کی وبا سے فرار یا وبا کی جگہ پر قرار جیسے موضوعات پر مراجع و مصادر کی روشنی میں بحث اور مناظرہ کا ایک علمی سماں قائم ہو جاتا تھا۔ عصر حاضر میں بظاہر ان کی ضرورت یا اہمیت سے اعراض کیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے تمدنی اور تہذیبی معاشرہ میں دین کی صحیح فہم اور حدیث و سنت کی کامل پیروی اور زیادہ مستند روایتوں پر یقین کے لیے اس قسم کے علمی مباحث کی افادیت اپنی جگہ مسلم رہی۔

محدث کبیر علامہ مبارک پوری کے مذکورہ دونوں رسالے مختصر ہونے کے باوجود محدثانہ تحقیق کے عمدہ نمونے ہیں۔ جس میں نماز عیدین کی تکبیرات زائدہ کے متعلق بتایا گیا کہ یہ بارہ تکبیریں ہیں، اس قول کی تائید اور حنفیہ کے مسلک کی تردید میں بحث کو سوال وجواب کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح طاعون کی وبا اگر کسی بستی میں عام ہو جائے تو اس وقت وہیں رہنا یا وہاں سے نکلنا دونوں میں احادیث اور احکام شرعیہ کی ہدایت کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں واضح کیا گیا کہ بستی سے نہیں نکلنا چاہیے۔ جن لوگوں کی نظر میں نکل جانا زیادہ بہتر ہے، ان کے دلائل کا جواب بھی دیا گیا۔ اب ان بحثوں کی ضرورت ہے یا نہیں اس سے قطع نظر فاضل مترجم نے ان دونوں رسالوں کو عربی قالب عطا کرنے کا اچھا کام کیا۔ رسالے مختصر تھے لیکن عصر جدید کے

تالیفی منہج و معیار یعنی احادیث کی تخریج، مؤلف کے سوانح، ان کی علمی زندگی اور تصنیفات و تالیفات اور بعض مقامات پر ضروری تشریح، ابواب کی تقسیم، فہرست و کتابیات ان سب نے رسالہ کو کہیں زیادہ مفید و نافع بنادیا۔ عربی زبان پر فاضل مترجم کا عبور اور مصادر و مراجع پر ان کی دسترس بھی لائق تحسین و آفرین ہے۔ عربوں اور عربی جاننے والوں کے لیے یہ رسائل واقعی قابل قدر علمی تحفے ہیں۔ (عمیر الصدیق ندوی)

مولانا محمد فضل الرحیم مجددی اور مولانا محمد شمشاد ندوی، **درّ نایاب**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت، مجلد، صفحات: ۹۶، قیمت: ۱۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۲ء، پتہ: جامعۃ الہدایہ، رام گڑھ روڈ پوسٹ آفس لال داس، جے پور، راجستھان ۳۰۲۰۲۷ اور لکھنؤ، دہلی، سہارنپور کے مشہور مکتبے۔

اخذ و جمع، ترتیب و تدوین اور تشریح و توضیح کی ایک اور اچھی مثال زیر نظر کتاب بھی ہے۔ یہ رام پور کے مشہور بزرگ مولانا شاہ محمد ہدایت علی نقشبندی مجددیؒ کے بعض مضامین سے ان کے ملفوظات وارشادات کا انتخاب بلکہ حسن انتخاب ہے جس نے بجا طور پر اس مجموعہ کو درنایاب کا عنوان دے دیا۔ مولانا مجددی افغانی النسل تھے، آباء و اجداد رام پور میں بس گئے، لیکن زمانہ کی گردش سے مولانا مجددی نے جے پور میں اقامت اختیار کی۔ یہاں دینی تعلیم کا فروغ ان کے پیش نظر تھا، اس لیے مدرسہ و مسجد وغیرہ پر توجہ دی۔ لیکن ان کے عزائم کی تکمیل ان کے نبیرہ مولانا عبدالرحیم مجددی کے نصیب میں آئی اور جامعۃ الہدایہ جیسی شاندار تعلیم گاہ نے جے پور شہر کے گلابی رنگ میں علوم اسلامیہ کے گلابوں کی تازگی لادی، اب مولانا فضل الرحیم مجددی اس گلشن کے نگہبان ہیں، انھوں نے اپنے رفیق علمی مولانا محمد شمشاد کے تعاون سے شاہ ہدایت علی مجددیؒ کی کتابوں سے مفید مطلب اقتباسات جمع کر لیے۔ شاہ ہدایت علی مجددیؒ کی کتابوں میں معیار السلوک کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ ۱۹۳۶ء میں معارف پریس سے طبع ہوئی تھی۔ یہ دارالمصنّفین سے شاہ صاحب کے تعلق کی گویا خوش گوار یاد بھی ہے۔ معیار السلوک کے علاوہ احسن التقویم، فتوح الحرمین اور درّ لاثانی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے لیکن زیادہ تحریریں معیار السلوک ہی سے ماخوذ ہیں اور ان ہی موضوعات پر ہیں جن سے ادب تصوف پر ثروت ہے، چھوٹے چھوٹے جملوں اور اقتباسات میں زندگی کی بڑی بڑی سچائیاں سامنے آجاتی ہیں۔ کوئی عبارت، نفع سے خالی نہیں۔ ہر اس موضوع پر جو انسانی زندگی کی روح کی تازگی کا سبب بن سکتا ہے۔ لطائف و نکات کا خزانہ ہے۔ جیسے حج کی انفرادیت پر چند سطری مضمون میں ہے کہ حج سے علم الیقین ہی نہیں بلکہ مقامات متبرکہ کا عین الیقین بھی نصیب ہوتا ہے۔ یہ شرف خاص رکن حج ہی کو حاصل ہے۔ اسی طرح یہ کہ خدا کی حمد و ثنا کے واسطے حضرت نبی کریم ﷺ اور آپؐ کی

تعریف کے واسطے خدا کی تعریف کافی ہے، خلق، خالق کی اور اس کے حبیبؐ کی کیا تعریف کر سکتی ہے؟ صحبتِ خاصان گویا باران رحمت ہے، جس طرح زمین پر رنگا رنگ کا سبزہ اور پھل اگتا ہے اسی طرح صحبت علمائے ربانی سے دل میں رنگ برنگ کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں اور بغیر فضل خدا اور عنایات خاصان خدا کامیابی نہیں ہوتی۔ ایسی دل سے نکل کر دل میں اتر جانے والی باتوں نے اس مجموعہ کو حقیقتاً درنایاب بنادیا۔ اس کے مطالعہ سے دل کو غذائے روحانی مل کر رہے گی۔ (ع۔ ص)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، **کلیات خطبات شبلی**، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۳۴۴، ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، اردو گھر ۲۱۲ روز ایوینو، نئی دہلی، سن اشاعت، ۲۰۲۳ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، ای میل : farouqui@yahoo.com

علامہ شبلی نعمانیؒ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطابت کا خاص جوہر عطا ہوا تھا۔ اردو کے قس بن ساعدہ مولانا آزاد نے ان کے خطبات کی خوبی یہ بتائی ہے کہ وہ جس موضوع پر چاہتے تھے ایک مرتب اور مدون کتاب حاضرین کو سنا دیتے تھے۔ بلحاظ ترتیب مطالب اور حسن استدلال وہ ایک رسالہ ہوتا۔ گویا تقریر کے ساتھ ساتھ سامعین کو تحریر کی لذت سے بھی آشنا کر دیتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مولانا ملک و قوم کے لیے ضروری موضوع پر ہی خطبہ دیتے تھے۔ دارالمصنّفین نے ان کے خطبات کا ایک مجموعہ بہت پہلے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے مزید پندرہ خطبات دریافت کیے جس کو خطبات شبلی (نودریافت) کے نام سے دارالمصنّفین نے ۲۰۲۱ء میں شائع کیا لیکن ابھی اس دریافت پر دوسال کا عرصہ ہی گذرا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ جستجو نے مزید خطبات دریافت کر لیے۔ انہوں نے دونوں مطبوعہ مجموعوں میں نودریافت خطبات کو شامل کر کے اس پر ایک مبسوط اور پر مغز مقدمہ لکھ کر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے شائع کرایا۔ اس طرح اب تک کے کل ۳۸ دستیاب خطبات کا جامع اور مکمل مجموعہ سامنے آگیا ہے۔

ان نودریافت خطبات کا بھی زیادہ حصہ تعلیم و تعلم سے متعلق ہے۔ ان میں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت، مذہبی اور قدیم وجدید تعلیم، نصاب تعلیم، جبری ابتدائی تعلیمی بل، چھوٹے یا کم درجہ اسکولوں کا قیام، قدیم عربی نصاب کے نقائص، علما کے فرائض، ندوہ کی ضرورت جیسے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی روشنی میں قوم آسمان ترقی کو چھو سکتی اور دوسری قوموں پر سبقت حاصل کر سکتی ہے۔

فاضل مرتب کے سلیقۂ ترتیب و تدوین کا سب کو اعتراف ہے۔ انہوں نے معارف کے علاوہ بعض قدیم اردو رسائل وجرائد اور دیگر ذرائع علم و تحقیق سے ان منتشر شہ پاروں کو جمع کیا اور

خطبات کی تفہیم و توضیح، ان کے پس منظر اور ماخذ پر مشتمل ہر خطبے کی پیشانی پر مختصر مگر جامع تحریر بھی سپرد قلم کی ہے۔ بعض آیات قرآنی آدھی ادھوری تھیں ان کو پورا کردیا۔ حواشی میں قابل تعارف شخصیات پر بھی ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ اردو شارٹ ہینڈ جیسے جدید و منفرد موضوع پر علامہ کے خطبے کا انکشاف بہت خوشگوار ہے۔ بعض مشہور فارسی اشعار کی تخریج سے مجموعے کی افادیت میں مزید چار چاند لگ جاتا۔ مثال کے طور پر ص ۲۵۴ پر فارسی شعر طالب آملی کا ہے۔ ان کے دیوان میں موجود ہے:

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

یا ص ۲۵۵ پر شیخ سعدی کا مشہور شعر نقل ہوا ہے۔ یہ گلستاں باب دوم در اخلاق درویشاں میں موجود ہے:

ترا کے میسر شود ایں مقام دوستانت خلاف است و جنگ کہ با

ص ۳۷۱ پر فارسی کے اس شعر:

اے فخر رسل قرب تو معلوم شد دیر آمدۂ راہ دور آمدۂ

کے پہلے مصرعے میں معلوم میں ایک م اور دوسرے مصرعے میں راہ سے پہلے غالباً ز چھوٹ گیا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب اس محنت اور تحقیق پر یقیناً مبارک باد اور اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔

(کلیم صفات اصلاحی)

شاہی ارریاوی، **پیام حاضر**، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۸۰، ملنے کا پتہ: الکتاب بک سینٹر، یتیم خانہ کمپلیکس، صالح نگر، ارریا (بہار)، سن اشاعت، ۲۰۲۱، قیمت: ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۳۴۷۸۸۶۲۸

ای میل: alkitabbookcenterararia@gmail.com

شعر و شاعری سے اگر با مقصد کام لیا جائے تو یقیناً یہ جسم کو گرمانے اور روح کو تڑپانے کا اہم ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کہنے کو تو پیام حاضر کے شاعر نے اپنی نوا سنجیوں سے ملک کے گرم مگر ملت کے سرد و جامد ماحول میں ایک ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور چاہا ہے کہ ملت کا ہر فرد مقدر کا ستارہ بن کر آسمان دنیا پر جگمگائے اور اپنی تب و تاز سے جہالت و منافقت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو چھانٹ دے لیکن نوجوانوں کی بے حسی و آشفتہ مزاجی سے امید یہی ہے کہ ان کی یہ آواز صدا بہ صحرا ہی ثابت ہو گی۔ ایسے میں شاعر کا یہ عزم قابل دید ہے:

میں موت تلک کوشش پیہم میں رہوں گا شاید کہ چراغاں ہو مرے سوز جگر سے

شاعر ابھی طالب علم ہیں لیکن اس عمر میں کلام میں اس قدر پختگی و بالیدگی اگر آئی ہے تو اس کا سبب یقیناً ملت کے نوجوانوں کی زبوں حالی کا بنظر غائر ان کا مطالعہ و مشاہدہ اور عظمت رفتہ کی

بازیافت کا جذبہ ہی قرار دیا جاسکتاہے۔ان کا یہ خیال ہے کہ قلعۂ اسلام کی فصیلیں مختلف سمتوں سے منہدم ہورہی ہیں۔وقت کی ضرورت اور تقاضا ہے کہ ان کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔اس کا حل انہوں نے سیاسی شعور کی بیداری میں تلاش کیاہے۔اگر مسلمان سیاسی لحاظ سے بیدار ہوں گے تو ان کے بقیہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر نظموں کا موضوع حکومت وسیاست ہے۔انہوں نے نوجوانوں کو موجودہ سیاست کو قریب سے دیکھنے، پرکھنے اور اپنے اسلاف کے طرز سیاست سے باخبر رہنے کا پیغام دیاہے:

حکمرانی ہماری روایات ہیں بن کے بیٹھے رہیں گے گدا کب تلک

یا یہ شعر دیکھیں:

سیاسی زور و قوت عصر نو میں مونس و غمخوار سیاست دور حاضر میں مسلماں کے لیے تلوار

مؤمن کی یہی شان کہ آزاد ہے مؤمن مؤمن کے لیے حلقۂ زنجیر نہیں ہے

شاعر نے ہر نظم کو ایک الگ عنوان سے معنون کیاہے۔بعض نظموں میں خالد بن ولید، صلاح الدین ایوبی، ٹیپو سلطان، ابوالکلام آزاد اور شیخ الہند کے کارناموں کو پیش کیا گیاہے۔بعض میں بغداد واندلس کے انجام سے باخبر کیا گیاہے۔بعض میں ملک و وطن کے سماجی و سیاسی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو ماضی وحال دونوں زمانوں کا ادراک ہے۔ جیسے:

ہیں غلامی پر یہ راضی غیر کے محکوم ہیں حکمرانوں کی ہیں نسلیں آہ! کہ دیکھو ذرا

ہند ہی کیا دہر میں وہ سوختہ ساماں ہوئے کل تلک جن کے اشاروں پر تھا اک عالم فدا

عصر حاضر کے تقاضوں سے ہیں یہ ناآشنا خواب غفلت میں پڑے ہیں تان کر غافل ردا

ملت کے غیور نوجوانوں کو طوفان اور غلامانہ ذہنیت سے حریت آشنا کرنے کے لیے جس زور واثر اور جس جوش وآہنگ کی ضرورت ہے ان سب کا استعمال نظموں میں دکھائی دیتاہے۔اس ضمن میں یہ سوال اہم ہے کہ کیازور بازواور جوش بیان ہی کافی ہے؟۔بعض مشہور اہل علم حضرات نے نوجوان شاعر کی پیامیہ شاعری میں علامہ اقبال کا عکس محسوس کیاہے اور مستقبل میں عظیم شاعر ہونے کا مژدہ بھی سنایاہے۔تاہم مختلف قوموں اور تہذیبوں کے تقابلی مطالعہ سے فکر میں جو وسعت افلاک آتی ہے اور جو علامہ اقبال کے شاعرانہ اوصاف وکمالات کا طرۂ امتیاز ہے شاعر کو وہاں تک پہنچنے میں ابھی وقت درکار ہے۔البتہ کلام میں روانی، اسلوب بیان میں برجستگی، اشعار میں شعریت، زبان میں شگفتگی، خیال میں ابتکار وجدت سے انکار مشکل ہے۔پیام حاضر کا پیام اس لائق ہے کہ اس پر کان دھرا جائے۔ (ک۔ص۔اصلاحی)

ادبیات

نعت پاک ﷺ

وارث ریاضی
کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج)، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار
موبائل نمبر: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

(اسی نعت کی زمین میں اختر شیرانی مرحوم کی ایک نعت سے متاثر ہو کر)

رنج و غمِ حیات کا درماں تمھیں تو ہو
تسکینِ کائنات کا ساماں تمھیں تو ہو

وہ جس سے ملی رشد و ہدایت کی روشنی
وہ آفتابِ عالمِ امکاں تمھیں تو ہو

جس بوے آگہی سے معطر مشامِ جاں
وہ نو بہارِ گلشن عرفاں تمھیں تو ہو

علم و عمل کی شان، جہاں میں تمھیں سے ہے
فکر و نظر کی شمعِ دبستاں تمھیں تو ہو

انسانیت کو جن سے ملی ہے حیات نَو
وہ داعی دیں، حامل قرآں تمھیں تو ہو

واقف نہیں جہان میں جس راز سے کوئی
وہ راز دار محفلِ یزداں تمھیں تو ہو

وہ جن کی رحمتوں کی کوئی انتہا نہیں
وہ رحمتِ حق، محسنِ انساں تمھیں تو ہو

دنیا کے راہ بر ہوں کہ عقبیٰ کے رہ نما
دونوں جہاں میں سب سے نمایاں تمھیں تو ہو

یادوں سے جن کی بزمِ عقیدت ہے گل فشاں
آئینہ دارِ جشنِ بہاراں تمھیں تو ہو

وارث حسن[1] کو موجِ حوادث کی فکر کیا ؟
مشکل کشاے گردشِ دوراں تمھیں تو ہو

---

[1] ناچیز کا اصل نام

غزل

مقصود احمد مقصود
سابق صدر، شعبۂ فارسی، عربی واردو، بڑودہ یونیورسٹی، بڑودہ ۳۹۰۰۰۲، گجرات، انڈیا

راہِ ہستی میں قدم پھونک کے دھرنا ہوگا
رنگ اس میں ہمیں ہر حال میں بھرنا ہوگا

مالک الملک کے دربار میں جانے کے لیے
شہِؐ کونین کے کوچے سے گزرنا ہوگا

جاوداں زیست ہے مطلوب اگر دل سے تمہیں
موت سے پہلے ہی تم کو یہاں مرنا ہوگا

یادِ مولیٰ میں ہی جینا، رہِ حق میں مرنا
کام مشکل ہے بہت پھر بھی یہ کرنا ہوگا

اس سے ملنے کی تمنا ہے جو دل میں مقصودؔ
مثل کندن کے تمہیں خوب نکھرنا ہوگا

غزل

ڈاکٹر راہی فدائی
بنگلور، کرناٹک

میں وہ صفر ہوں، جسے چاہتے ہیں سبھی عدد　　میں ترقیوں کی سند ہوں، پھر بھی ہوں بے سند

یہ ہمارا شیوۂ صلح کل، یہ مفاہمت　　نہ مزاج ضد، نہ کوئی طبیعت ردوکد

پر جبرئیل سے کیا غرض؟مری رہ الگ　　میں پرند شوق ہوں، میری کوئی نہیں ہے حد

یہی غاردل، یہاں بے خطر چلے آیئے!　　نہیں لازمی رہے منتظر سر رہ اسد

میں کبھی بنوں جو امین نغمۂ کن فکاں　　کروں طے یہ چشم زدن میں فاصلۂ ابد

تھیں ہزار حصۂ لمحہ میں یہ سیاحتیں　　ہو سوار نور چلا ہے کوئی مع الجسد

وہ ہے شاہ رگ سے قریب، اس کا کہیں پہ بھی　　نہ شریک ہے نہ سہیم، وہ ہے احد صمد

یہ سفر ہمارا رہین منت رہ گزر　　نہ ہی منزلوں کا پتا ہمیں، نہ ہے جہدوجد

نہ فرشتہ ہوں، نہ میں متقی،بطفیل حق　　نہیں سینے میں مرے نار محرقۂ حسد

رہی مدتوں سے یہ دوستی بڑی چاہ سے　　ہوئی دیر، اب نہ ملے گا فارق نیک وبد

کہو اس سے یہ، کہ حدود میں رہے راہیاؔ!
سر فوق روح رواں کبھی نہ رہی خرد

غزل

جمیل مانوی
سہارنپور

نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ میں مسیحا ہوں
مگر میں درد کے ماروں کا دکھ سمجھتا ہوں
میں جس خلوص کی امید تم سے رکھتا ہوں
اسی خلوص کا میں معتبر حوالہ ہوں
یہ میری تلخ نوائی یہ بزم جاں سے گریز
کسے خبر ہے میں کن مرحلوں سے گذرا ہوں
وہ روشنی سے گریزاں میں روشنی کا سفیر
جوان کے دل میں کھٹکتا ہے میں وہ کانٹا ہوں
جو اپنے دامنِ رحمت میں ڈھانپ لیتا ہے
اسی کے دامنِ رحمت کی آس رکھتا ہوں
جلو میں جس کے فرشتے قیام کرتے ہیں
خبر بھی ہے یہ زمانے کو، میں اسی کا ہوں
تری طلب ہی متاعِ حیات ہے لیکن
گواہ رہ، کہ طلب سے بھی ہاتھ اٹھاتا ہوں
قدم سنبھال کے رکھتا ہوں یہ خطا ہے مری
میں اس قصور کا بھی اعتراف کرتا ہوں
کسی سے کوئی شکایت نہ دل میں داغ کوئی
اگر یہ سچ ہے تو آنکھوں سے کیوں جھلکتا ہوں
وہ آستانِ محبت مجھے بھلا بھی چکا
جس آستاں کو میں اپنا سمجھ کے بیٹھا ہوں

یہ کھڑکیاں یہ دریچے یہ در سبھی بے نور
میں ان دنوں تری بستی میں کتنا تنہا ہوں
چلو یہ مان لیا مجھ سے بے خبر ہو تم
مگر یہ علم تو ہوگا کہ تم پہ مرتا ہوں
گلے لگا کے کسی کو سکوں ملے نہ ملے
گلے لگانے کی حسرت تو دل میں رکھتا ہوں
مرا جنوں بھی کسی دن تو رنگ لائے گا
میں ارضِ دل میں محبت کے بیج بوتا ہوں
بہار دامنِ صحرا کو چھو کے گذری تھی
جو یاد ہو، میں وہی بدنصیب صحرا ہوں
کبھی زمیں پہ بگولے اڑائے پھرتے ہیں
کبھی افق پہ ستارا سا جھلملاتا ہوں
جو سچ کہوں تو مجھے عافیت پسند نہیں
جنوں جو راہ دکھائے اسی پہ چلتا ہوں
جو دشمنوں سے کیا جائے وہ سلوک نہ کر
میں ابر بن کے تری وادیوں پہ برسا ہوں
یہ میرا دل جو تجھے آئینہ سمجھتا ہے
یہ تیرا عشق میں جس کے لیے سنورتا ہوں
یہ تیرا غم مری تقدیر کی امانت ہے
برا نہ مان اگر تجھ سے بھی چھپاتاہوں
مرا جہاں ہیں یہ وحشت زدہ سی دو آنکھیں
میں ان میں اپنی جوانی تلاش کرتا ہوں
کوئی شریک نہیں میری جستجو میں جمیلؔ
یہ میری آگ ہے، جس آگ میں سلگتا ہوں

معارف ــــ کی ڈاک

معارف

قاضی ضیاء الدین سنائیؒ پر میرے مضمون کے شائع نہ ہونے کی اطلاع، آں مکرم کے مراسلہ سے ملی، اس سے پہلے کوئی اطلاع نہیں تھی، دفتر سے اس سلسلہ میں کوئی خبر نہیں آئی۔ مضمون بھیجنے کے دوسرے دن ضابطہ کی صرف یہ مختصر سی اطلاع آئی تھی، کہ میرا مضمون مل گیا ہے، اب تقریباً پانچ مہینہ کے بعد معلوم ہوا کہ معارف میں موجودہ نئی پالیسی کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کے شائع نہ ہونے کی جو وجہ لکھی گئی ہے، کیا وہ کسی حد تک مناسب اور قابل قبول ہے؟

جب آں مکرم نے معارف میں اس شرط کا اعلان کیا تھا، اس وقت بھی کئی اہل علم نے اس پر توجہ دلائی تھی، لکھا تھا، وہ مراسلے معارف میں بھی چھپے تھے[1] اور اب تک بھی اہل علم کی مجلسوں میں جب کبھی معارف کا تذکرہ آتا ہے تو یہ بات بھی ضرور آتی ہے، اس وقت تک کسی عالم و فاضل سے اس کی تائید نہیں سنی اور اس سے اتفاق بھی نہیں دیکھا۔

معارف جب سے چھپ رہا ہے، تقریباً اسی وقت سے اس میں قسط وار مضامین چھپتے رہے، دو، دو قسطوں کے مضامین کا تو شمار ہی نہیں، بعض مضامین سات آٹھ قسطوں میں اور بعض اس سے بھی زیادہ میں چھپے، اس کے علاوہ اردو کے تمام علمی تحقیقی مجلات میں قسط وار مضامین اہتمام سے چھپے اور اب بھی چھپتے رہتے ہیں، غالباً عربی زبان وغیرہ میں بھی اس کا معمول ہے[2]۔

دوسرے، یہ بات ممکن ہی نہیں کہ ہر ایک طویل مضمون کتابی صورت میں شائع ہو، علمی رسائل میں مضامین کے شائع ہونے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر اہل علم و ذوق کی نگاہیں پڑ جاتی ہیں، اس میں کچھ تصحیحات و اضافے بھی ہو جاتے ہیں، کتابی صورت میں مضامین کا چھپنا کم ہی ہوتا ہے اور اگر یہ رسائل علمی مضامین کو نہیں چھاپیں گے تو ان رسائل کی افادیت ہی کیا باقی رہے گی؟ آں مکرم کے اس نظریہ سے شاید اہل علم میں سے کسی کو اتفاق ہو۔

---

[1] ایسے مراسلے میرے علم میں نہیں ہیں۔ صرف فارسی نظموں کی عدم اشاعت پر ایک مراسلہ آیا تھا اور وہ بھی صرف انھیں صاحب کی طرف سے جن کی فارسی نظمیں شائع ہونا بند کر دی گئی تھیں۔ اس قسم کا ہر مراسلہ معارف میں شائع ہوتا ہے۔ صرف ایسے مراسلے نظر انداز کئے جاتے ہیں جو بہت طویل اور غیر ضروری ہوں (مدیر)

[2] پرانے عربی پرچوں میں اس کا امکان ہے۔ آجکل کے عربی مجلات میں یہ نظر نہیں آتا ہے (مدیر)

معارف میں میرے مضامین پچھلے اڑتالیس سال سے چھپ رہے ہیں، میرا سب سے پہلا مضمون ۱۹۷۵ء میں معارف میں چھپا تھا، خیال تھا کہ آئندہ سال تک پچاس سال پورے ہو جائیں گے اور اب یہ کہا گیا کہ خاص پالیسی کی وجہ سے اب نہیں چھپ سکتا[۳]۔

آخر میں ایک بات اور جو میں بہت پہلے لکھنا چاہتا تھا لیکن نہیں لکھا تھا کہ مہربانی کر کے ان چھوٹی جزوی باتوں کو چھوڑ کر، معارف کے معیار پر توجہ کی جائے۔ تقریباً پچھلے دو تین سال میں معارف میں کئی مضامین ایسے چھپے ہیں، جو یقیناً معارف کے معیار کے نہیں تھے اور بعض تو لائق اشاعت ہی نہیں تھے[۴]۔ امید ہے کہ اس پالیسی پر توجہ کی جائے گی اور اس کو تبدیل کر دیا جائے گا اور معارف کے معیار پر بطور خاص توجہ کی جائے گی۔ طویل تحریر کے لئے معذرت خواہ!

نور الحسن راشد کاندھلوی

۵۸۱۱۸ ۹۵۲۸۰

محترم!

دسمبر کے شذرات میں وانا لجمیع حاضرون لکھ دیا گیا ہے، صحیح حاذرون ہے۔

ڈاکٹر حسین محمد، بھوپال

---

[۳] مکرم مراسلہ نگار کے مضمون میں کوئی خرابی نہیں تھی لیکن معارف کی موجودہ پالیسی کے تحت بہت طویل اور قسط وار مضامین نہیں شائع ہوتے کیوں کہ ہمارے پاس مضامین کی بھرمار ہے جن کو موقع دینا بھی ضروری ہے۔ اس پالیسی کی وجہ سے خود میرے لمبے مضامین معارف میں نہیں شائع ہوتے ہیں (مدیر)

[۴] عمومی رائے زنی کرنے کے بجائے، مؤقر مراسلہ نگار کو تخصیصاً بتانا چاہئے تھا کہ فلاں فلاں مضمون قابل اشاعت نہیں تھے (مدیر)

رسید کتب موصولہ

سید نفیس دِسنوی، **آئینۂ ادراک (مجموعۂ مضامین)**: سہ ماہی ادبی محاذ، دیوان بازار، کٹک (اڈیشا)، صفحات:۲۰۸، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۲۵۰روپے، موبائل نمبر:۹۴۳۷۰۶۷۵۸۵

حکیم وسیم احمد اعظمی، حکیم مصباح الدین اظہر (مترجم)، **اردو طبی ادب میں غیر مسلم اطباء کی خدمات (ہندی)**: مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ علی گڈھ، صفحات:۳۰۴، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۵۰۰روپے، موبائل نمبر:۸۳۸۳۰۹۶۷۱۵

عبداللہ غازی ندوی، **اسلام کا سپاہی**: ادارہ ادب اطفال بھٹکل (کرناٹک)، صفحات:۱۰۶، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۴۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۹۱۶۷۷۱۴۱۴

ہریزان ایم ڈی نون، **اسلامک پرسپکٹیو آف سوشیالوجی اینڈ اینتھروپولوجی سم ریفلکشنس**: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ اینڈ ساؤتھ ایسٹ ایشیا، ملیشیا، صفحات:۱۹۹، سالِ اشاعت:۲۰۱۷ء، قیمت درج نہیں، ایمیل:iiit.eastasia@gmail.com

ڈاکٹر غلام سرور، **بنگال کا فارسی ادب: عہد سلاطین میں**: بک امپوریم، پٹنہ، صفحات:۳۸۴، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۳۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۳۰۴۸۸۸۷۳۹

عمران علی آبادی (مرتب)، **ڈاکٹر انور حسین اور ان کی بکھری تحریریں (حصہ اول)**: دانش محل، امین آباد، لکھنؤ، صفحات:۲۷۲، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت ۴۰۰روپے، موبائل نمبر: ۸۸۵۳۱۰۴۴۹۳

نصر ایم عارف اینڈ عباس پناک کل، **ساؤتھ ایشین اسلام**: راؤٹ لیج ٹیلر اینڈ فرانسس گروپ، لندن اینڈ نیویارک، صفحات:۲۴۶، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت درج نہیں، www.routledge.com

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی، **سہ روزہ جشن ادب اطفال**: پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات:۳۱۴، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۴۰۰روپے، موبائل:۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

جلال الدین اسلم، **منتخب مجموعۂ مضامین نقد و نظر**: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، صفحات:۶۴۸، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۸۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۶۸۳۶۰۴۷۲

کرامت علی کرامت، **نیا تنقیدی قوس و دائرہ**: اڈیشا اردو اکادمی، سنسکرتی بھون میوزیم کمپلیکس، بی۔جے۔بی نگر، بھوبنیشور (اڈیشا)، صفحات:۳۹۱، قیمت:۴۵۰روپے، موبائل نمبر درج نہیں۔

تصانیف علامہ سید سلیمان ندویؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
خطبات مدراس	150/-	**سلسلۂ سیر الصحابہ،**	
رحمت عالم	60/-	**تابعین وتبع تابعین**	
سیرت عائشہؓ	250/-	سیر الصحابہ اول (خلفائے راشدین)	320/-
حیات شبلیؒ	800/-	سیر الصحابہ دوم (مہاجرین اول)	200/-
یادرفتگاں	350/-	سیر الصحابہ سوم (مہاجرین دوم)	300/-
بہادر خواتین اسلام	40/-	سیر الصحابہ چہارم (سیر الانصار اول)	300/-
تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	550/-	سیر الصحابہ پنجم (سیر الانصار دوم)	200/-
عربوں کی جہاز رانی	160/-	سیر الصحابہ ششم (امام حسنؓ.....کے حالات)	200/-
عرب وہند کے تعلقات	200/-	سیر الصحابہ ہفتم (اصاغر صحابہ)	300/-
برید فرنگ	150/-	سیر الصحابہ ہشتم (سیر الصحابیات)	100/-
سفرنامۂ افغانستان	100/-	سیر الصحابہ نہم (اسوۂ صحابہ اول)	260/-
انتخابات شبلی	200/-	سیر الصحابہ دہم (اسوۂ صحابہ دوم)	300/-
نقوش سلیمانی	350/-	سیر الصحابہ یازدہم (اسوۂ صحابیات)	75/-
خیام	220/-	اہل کتاب صحابہ وتابعین	210/-
ارمغان سلیمان	250/-	تابعین	250/-
رسالہ اہل سنت والجماعت	30/-	تبع تابعین اول	230/-
دروس الادب (اول)	15/-	تبع تابعین دوم	320/-
دروس الادب (دوم)	20/-	****	

JAN 2025 Vol- 212(01) ISSN 0974-7346 Ma arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA ARIF** AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org